پرندے

مستنصر حسین تارڑ



"پکھیرو" کے اُردو ترجمے کے لیے مَیں محترم محمّد سلیم الرحمٰن کے مشوروں
اور راشد جاوید احمد کی کاوشوں کا شکر گزار ہوں ۔

سرورق : پروفیسر سعید اختر

١

ایک گدھ نے دوسرے سے کہا "نیچے دیکھ"۔
دوسرے گدھ نے پَر پھیلائے "نیچے تو کچھ بھی نہیں ــــ ایک بندہ ہے، اجاڑ بیابان ہے اور ایک ٹنڈ منڈ درخت ــــ بس! ــــ کھانے والی تو کوئی چیز نہیں"۔
"بندہ ہی تو کھانے والی چیز ہے، احمق ــــ" پہلے گدھ کے پروں کا سناٹا ہے کے ایک بٹّے کی مانند آسمانوں کے چُپ چاپ شیشے پر گرا اور اُسے چکنا چور کر گیا۔ "کیونکہ یہ دوسرے جانوروں سے مختلف ہوتا ہے ــــ اپنے آپ کو تمام جانداروں سے بلند و برتر سمجھتا ہے ــــ اشرف المخلوقات ــــ لیکن اس کے بھائی بند ــــ اِسے جیتے جی مار ڈالتے ہیں ــــ اور مرا ہوا بندہ کس کام کا؟ ــــ پھول کر کُپّا ہو جاتا ہے ــــ بُو دینے لگتا ہے ــــ زندگی کی رمق ختم ہونے سے اُس کا گوشت بھی پھیکا اور بدمزہ ہو جاتا ہے، ایک نوالہ لیتے ہی پیٹ اپھر جاتا ہے ــــ لیکن ایسا جیتا جاگتا بندہ جو اپنے ہی بھائی بندوں کے ہاتھوں زندہ درگور ہو جاتا ہے، اوہ، وہ بہت لذیذ ہوتا ہے ــــ ایک مرتبہ چونچ مارنے سے اُس کی لاتعداد خواہشوں کا تازہ خون تمہارا

حلق تر کر دیتا ہے ـــــ بے شک اس کی آنکھوں کے ڈھیلے نکال کے کھا لو ـــــ
وہ خاموش کھڑا رہے گا اور پرچ پرچ کا مرا ہوا بندہ؟ نہ نہ کسی کام کا نہیں ـــــ
بلیاں کتّے کھانا اس سے بہتر ـــــ"

دوسرے گدھ کے سُرخ تالو میں خون کا سلُونا سواد پھُوٹا تو اس نے اپنی چونچ
سختی سے بند کر لی مبادا یہ سواد کھو نہ جائے ـــــ

"تو نے بندہ کبھی نہیں کھایا؟" پہلے گدھ نے اس طرح پوچھا جیسے کوئی سادہ لوح
اپنے بیٹے سے پوچھے کہ ابے تو نے شکر والا شربت کبھی نہیں پیا؟

"کوئی ایک بار ـــــ" دوسرے گدھ نے چونچ کھولی "گذشتہ برس سیلاب میں
مردہ مویشیوں کے درمیان ایک آدھ بندے کی لاش بھی تو تیرتی آجاتی تھی ـــــ اور
پھر وہ گھبرو یاد ہے جو چار جماعتیں پڑھ کے یہ سمجھنے لگا تھا کہ اُسے چودھری سے
ٹکرّ لینے کا حق مل گیا ہے؟ ـــــ اُس نے چودھری کے احاطے میں بندھے ڈنگروں
کے بارے میں جا کے پولیس سے شکایت کی کہ ڈنگر تو چرا کر لائے گئے ہیں ـــــ اگلے
روز اُس کے جسم کے حصّے بیلے میں بکھرے ہوئے تھے ـــــ میں نے اسے کھایا ـــــ
اُس کی ٹانگیں، بازو اور پیٹ تو وہاں تھے لیکن اس کا سر کہیں نظر نہ آیا ـــــ
کچھ مزا نہیں آیا تھا کیونکہ تجھے پتا ہی ہے کہ میں دماغ اور آنکھیں کتنے شوق سے کھاتا
ہوں ـــــ پھر وہ شادی شدہ عورت بھی جسے رات بس نہ ملی تو وہ انتظار گاہ میں جا
سوئی۔ رات کو معززین شہر نے اس کے بدن کو نوچا (ہماری جگہ) اور صبح اُسے ریلوے
لائن پر پھینک آئے ـــــ میں نے گندے نالے میں بہتا ہوا وہ بچہ بھی کھایا تھا
جس کا جسم ابھی ماں کے خون میں لتھڑا ہوا تھا، جس کی حیاتی کی گاڑی چلنے سے پیشتر
ہی کھڑی ہو گئی تھی ـــــ اور ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا، جنگیں بھی تو ہوتی ہیں ـــــ
اتنے بندے مرتے ہیں کہ اگر میرے پاس کولڈ سٹوریج ہو تو اُن سب کو سنبھال کے

رکھ لوں اور ساری عمر بیٹھا ٹھونگتا رہوں ـــــ کڑیل جوانوں کے یہ مُردے بڑے
لذیذ ہوتے ہیں ـــــ (کچھ شہید اور کچھ کافر ـــــ کون کیا ہے ـــــ یہ فیصلہ نہیں ہو
سکتا ـــــ سرحد کے ایک طرف مرنے والا شہید اور دوسری طرف مرنے والا ـــــ
کافر!)"

"تو مرے ہوئے بندوں کی باتیں کر رہا ہے ـــــ کبھی کسی جیتے جاگتے جسم
میں بھی چونچ ماری ہے؟"

"نہیں" ـــــ دوسرے گدھ نے ایک بھوکی آہ بھری "کبھی نہیں ماری ـــــ"

"تو پھر اپنی چونچ اور تیز کر لے ـــــ مرے ہوئے بندے کھانے کے دن لد
گئے۔ اب زمین پر ایسے قانون بن گئے ہیں کہ سارے سوچنے سمجھنے والے بندے
جیتے جاگتے مر چکے ہیں ـــــ ہم کھا کھا کے اپھر جائیں گے مگر وہ کم نہ ہوں گے ـــــ"

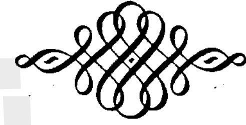
"تو پھر انتظار کیسا؟ آ اِس بندے کو کھا لیں"

"نہیں ابھی نہیں ـــــ" پہلے گدھ نے سمجھایا "ابھی وقت نہیں ہوا ـــــ"

دوسرے گدھ نے ایک اور بھوکی آہ بھری، گردن لمبی کی اور چُندھی آنکھوں
سے نیچے دیکھنے لگا ـــــ

ایک اُجاڑ، لق و دق میدان، جس کا کوئی انت نہیں، بے حساب جہاں تک نظر
جائے، سفید کلر زدہ زمین ـــــ کلر کی سفیدی آنکھوں کو چندھیاتی ہوئی ـــــ
درمیان میں ایک بندہ ـــــ تن تنہا، جیسے سانس روکے کھڑا ہو ـــــ جیسے پتھریلا
بُت ہو ـــــ اس کے آس پاس بھی کوئی شے نہ تھی، سوائے ایک ٹنڈ مُنڈ درخت
کے ـــــ نہ اُس پر پتے، نہ شاخیں ـــــ بندہ اور ٹنڈ منڈ درخت، دونوں چیزیں
گدھ کو اس طرح دکھائی دیں گویا کسی نے پتھر سے مورتیں گھڑ کے اُس چٹیل
میدان کے بیچ رکھ دی ہوں۔

"اگر میں نے اس پتھر کی مورت کے چونچ ماری تو کہیں میری چونچ ہی نہ ٹوٹ جائے۔" دوسرے گدھ نے سوچا ——— اس کے ساتھی نے سچ کہا تھا ——— نہیں ابھی نہیں ——— ابھی وقت نہیں ہوا۔



۲

دو سائے اُس کے اُوپر سے چپ چاپ گذر گئے۔

بندے نے ایک لمبا سانس لیا اور سر اُٹھا کر نظر آسمان میں گاڑ دی (دوسرے گدھ نے اسے سر اُٹھاتے دیکھا اور سوچا "نہیں پتھر کی مورت نہیں، سچ مچ کا بندہ ہے)۔ اس کے اوپر دو گدھ اس طرح پَر پھیلائے تیر رہے تھے جیسے اُن میں جان نہیں ——— اُس پتنگ کی طرح جس کی حیاتی کی ڈور کٹ جائے تو وہ چند لمحوں کیلئے اُسی طرح اُڑتی رہتی ہے ——— یہ گدھ کہیں میرے مرنے کی آس میں تو نہیں؟ کہیں یہ آسمان سے اُتر کر میری بوٹیاں نہ نوچ لیں؟ تنہائی کے اس میدان میں میری تو مدد کو بھی کوئی نہیں آئے گا۔ جسم میں چونچوں کے کھُبنے کی اذیت مجھ سے سہی نہیں جائے گی۔ مگر سہی کیوں نہیں جائے گی، وہ ذرا سا ہنسا ——— میرے جسم کو تو گدھوں کی چونچیں سہنے کی عادت ہے، یہ الگ بات کہ یہ چونچیں میرے اپنے ہی بھائی بندوں کی تھیں جو مجھے ساری زندگی نوچتے رہے ——— اب میں دکھ اور سکھ کی منزلوں سے کہیں دُور نکل چکا ہوں ——— گدھوں کو آنے دو، اُن کی تیز چونچیں بے شک میرے جسم میں اس طرح کھُب جائیں

جیسے تازہ مکھن میں کسان عورت کی اُنگلی کھُبتی ہے اور پھر بھی مجھے ذرا برابر پتا نہیں چلے گا۔

بندے نے نظریں آسمان سے اُتاریں اور اس ٹنڈ منڈ درخت کی طرف دیکھا جو اِس بے اَنت چٹیل میدان میں اُس کا اکیلا جاندار ساتھی تھا —— یہ ٹنڈ ہمیشہ سے یہاں نہیں تھا —— پہلے تو یہ جگہ بھی آس پاس کی طرح چٹیل اور بنجر تھی۔ پھر جُوں جُوں وقت گذرنے لگا آہستہ آہستہ زمین کے ایک بنجر ٹکڑے پر دُوب اُگنے لگی —— ایسی دُوب جو نہ تو کبھی ہری ہوتی تھی اور نہ ہی مکمل طور پر سوکھتی تھی۔ یہ دُوب اپنی حیاتی کیلئے زمین کے اندر سے اَن گنت زمانوں میں مرنے والوں کی ہڈیوں میں سے خون چوستی تھی۔ لیکن ان سب کا خون پینے کے باوجود اس پر سرخ پھول نہ کِھلے، ایسے پھول جو پَل دو پَل کے لئے بچھڑنے والوں کو واپس لاکر اُن کے گم گشتہ خدوخال کی جھلک اپنے میں دکھا گئے ہوں —— دُوب ویسی کی ویسی ہی رہی، نہ بالکل ہری نہ بالکل خشک —— وقت گذرتا گیا —— اَن گنت صبحوں میں سے ایک صبح ایسی آئی جب بندے نے دیکھا کہ اس کے سامنے اس کا ہمزاد کھڑا ہے —— اُس کا اپنا سایہ —— وہ سر سے پاؤں تک مسرت سے کانپنے لگا کہ چلو اِس ویرانے میں اُس کا اکلاپا توڑنے کے لئے کوئی روح تو وارد ہوئی —— پرنہ تو یہ اس کا ہمزاد تھا اور نہ سایہ —— یہ ایک سوکھا سڑا بے برگ ٹنڈ تھا، دُور سے یوں دکھائی دیتا جیسے کوئی بازو پھیلائے کھڑا ہو، یسوع مسیح صلیب میں پرویا ہو —— بندے نے سوچا، میں بھی کتنا کم عقل ہوں، میری طرح کتنے لوگ دین دنیا چھوڑ کر ویرانوں میں آکھڑے ہوتے ہیں۔ اس بیابان میں اور کون آئے گا پھر بھی شکر ہے میرا اکلاپا ختم ہوا، انسان نہ سہی زمین کے راستے سانس لینے والا ایک ٹُنڈ مُنڈ درخت ہی سہی —— اس طرح وہ ٹنڈ —— سُوکھی لکڑی کی مُورت، اس کا بیلی بن گیا —— بندہ اور ٹنڈ —— کلّر زدہ زمین کے بے کراں سفید سمندر میں چھوٹے

چھوٹے دو جزیرے ——

اُس لمبے چوڑے بے اَنت میدان میں ہمیشہ رُتیں بدلتی رہتی تھیں۔ سدا ایک رُت نہ رہتی تھی۔

کبھی اچانک سورج کی کوکھ میں سے لپکتے شعلوں کے ڈباؤ سیلاب بہہ نکلتے اور بندے اور ٹنڈ کے آس پاس پھیلے میدان کو بھرنے لگتے اور کبھی کلّر زدہ زمین میں سے شعلوں کی شُوکتی ہوئی زبانیں آسمان کی جانب لپکتیں اور پھر اُوپر سے نیچے آتے ہوئے شعلے اور نیچے سے اُوپر لپکتی ہوئی سُرخ زبانیں اس طرح گھل مل جاتے کہ زمین اور سورج کے درمیان ہر شے سلگنے لگتی۔ ٹنڈ کے دونوں بازو اور تنا بھی دھیرے دھیرے سلگنے لگتے اور بندہ؟ وہ تو پہلے سے ہی سُلگ رہا تھا۔ شعلوں کے اس جھکڑ کی وجہ سے ہر سُو اس طرح شور مچ جاتا جیسے عرشِ منوّرہ کے تمام دروازوں پر دُکھی مخلوق دستک دے رہی ہے —— کچھ دیر بعد شعلوں کے یہ سیلاب اپنی ہی تپش میں خشک ہونے لگتے اور پچھلے پاؤں واپس سورج کے اندر جا دفن ہونے۔ سُرخ زبانیں سکڑنے لگتیں اور زمین انہیں اپنے اندر کھینچ کر بھینچ کر سرد کر دیتی۔ پھر لشکتی ہوئی شیشہ دُھوپ یوں مدھم ہوتی چلی جاتی جیسے کسی نے اس کا کنٹرول سوچ گھما کر اس کی گرمی کو نارمل کر دیا ہو —— موت کا سایہ بھی تو زندگی کی گرمی کو آہستہ آہستہ چوس لیتا ہے اور یوں ہر شے میں سے حرارت نچُڑ جاتی۔ تپتی ہوئی زمین ٹھنڈی برف ہو جاتی۔ ٹُنڈ میں سے نکلتا دھواں فضا میں تحلیل ہو جاتا اور سردی اس کی خشک رگوں میں ایسے اُترتی کہ وہ ٹوٹنے لگتیں۔ ٹھنڈی برف ہوائیں اُڑتے ہوئے سانپوں کی طرح پھنکارنے لگتیں —— سارا میدان ایک مرے ہوئے بندے کے رخسار ہو جاتا، زرد اور سرد —— بندے کے جسم میں بھی برفوں کے ٹھنڈے بھالے اُترنے لگتے۔ اس کے پاؤں تلے کی زمین بھی ارد گرد کی ہر شے کی طرح یخ بستہ ہو جاتی۔

سردی اُس کے ٹوٹے ہوئے بوٹوں میں سے جذب ہوتی ہوئی اوپر چڑھتی اور ٹانگوں، گھٹنوں، پیٹ کو کپکپاتی دل کے آس پاس جا پہنچتی —— پر اس کا دل تو ہمیشہ سے ایک آگ تھا۔ باہر سردی ہو یا گرمی اندر ہمیشہ سائیں کا مچ جلتا رہتا اس الاؤ کی آنچ سردی کا راستہ روک لیتی۔ نیچے زمین سے آتا ہوا سردی کا زور اور اُدھر دل میں جلتے الاؤ کی حدت —— دونوں رقیبوں کی طرح بھڑتے رہتے۔ یوں نہ سردی ختم ہوتی اور نہ حدت۔

کبھی کبھار بالکل حبس ہو جاتا۔ ہوا اُس میدان میں آنے والے تمام راستے بھول جاتی —— کسی ایک جھونکے کی پھونک بھی سنائی نہ دیتی —— میدان ہوا کی اُڑان کو ترستا مگر وہ سارے راستے بھولے رہتی —— بندے کا سانس گھٹنے لگتا۔ اُس کا رُواں رُواں پیاسے پرندوں کی طرح منہ کھول دیتا (اگر مجھے اِسی طرح حبس میں تازہ ہوا کے بغیر زندگی گذارنا تھی تو اِس میدان میں آنے کی کیا ضرورت تھی، وہیں رہتا اُسی جہان میں) —— اور جب اُس کے پھیپھڑے اُسے یہ سندیسہ بھیجتے کہ انہوں نے سارے میدان میں سے ہوا کی آخری مُٹھی لپیٹ کر اپنے اندر ڈال دی ہے تو پھر —— پھر نہ جانے کونسی سمت سے ہوا کا ایک جھونکا کسی گم شدہ بچے کی طرح اُدھر آنکلتا اور اُس کے کھُلے، ترستے ہوئے منہ میں اُتر جاتا، اپنے گھر واپس آجاتا —— اور اس کے ساتھ ہی جھکڑ چلنے لگتے۔ آندھیوں کی شُوک لاکھوں آہوں کی طرح ہر سو گونجنے لگتی، کلر زمین کی گود سے الگ ہو کر آسمان کی جانب یوں اُڑنے لگتا کہ سارا میدان کورے کاغذ کی طرح سفید ہو جاتا۔ بندہ اور ٹنڈ اِن گھنے سفید ذرّوں میں سفید ہو جاتے۔ اَن گنت بگولوں کی چکیاں چلنے لگتیں اور بندہ اِن کے پاٹوں کے درمیان پستا چلا جاتا —— اور پھر یکدم آندھی کا زور ٹوٹنے لگتا۔ جھکڑ سانس روک لیتے —— اور اس طرح —— سورج میں سے شعلے بہتے رہے۔ سردی کا سمندر شوکتا رہا اور

جھکڑ اپنی ہی شدت میں شدید ہوتے رہے —— اور بندہ؟ بدلتی رُتوں کے اِس میلے میں جنگل میں گم ایک مسافر کی طرح حیران کھڑا رہا اور انتظار کرتا رہا —— کس کا؟ —— کیسا انتظار؟ —— اسے کچھ معلوم نہ تھا —— بس وہ وہاں کھڑا تھا اور انتظار کر رہا تھا —— لیکن یہ اُجاڑ میدان، یہ بے اَنت میدان کہاں تھا؟

اس جہان کے کونسے کونے میں روپوش تھا؟

یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔

یہ سوال، سوال ہی رہا، کسی نے جواب نہ دیا۔

شاید ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کہیں؟

یا شاید بندے کے خیالوں میں!

پتہ نہیں کہاں تھا۔

....

ایک قہقہہ!

ساون کا سیاہ بادل برسنے سے پہلے کڑکتا ہے، اس طرح کا۔

یہ کڑک اس کے آس پاس ویرانے میں گونجی۔

جیسے کُل خدائی ہنسنے لگے۔

روزِ محشر خلقت کا شور۔

قہقہے کا شور چاروں طرف پھیل گیا —— لیکن بندہ؟

وہ تو چپ تھا، ہونٹ بھینچے ہوئے سختی سے۔

کون ہنستا ہے!

اُس نے آس پاس کی ہر شے کو غور سے دیکھا۔

اُجاڑ میدان اور درمیان میں ٹنڈ کی صلیب ،

وہ چُپ تھے

اُس نے اپنے اندر جھانکا۔

یہ ہنسی تو اُس کی اپنی ہی تھی۔

چپ کے سانپ کے قریب سے آہستہ سے ، چپکے سے

باہر آجانے والی ہنسی ۔

ہنسی ، اُس کے اپنے لبوں کی مفرور

جونہی چُپ کا سانپ اُس کے ہونٹوں پر کُنڈلی مار کر بیٹھا ، اُس کے اندر امن ہوگیا۔ اس کے بعد جب بھی اُس نے اس سانپ کو چپ کی اس جونک کو ہونٹوں سے کھینچ کر اُتارا اور اُس نے لَب کھولے ، وہ گویا ہوا تو اُس کی دہائی کُل جہان میں آوارہ روحوں کی طرح پھیل گئی ۔ مگر پھر بھی ہر طرف چپ تھی ۔ اُس کو اپنی دہائی کا کوئی جواب نہ ملا . . . وہ بولتا رہا اور بول بول کر اُس کا گلا بیٹھ گیا ، کسی نے توجہ نہ کی ، جواب نہ دیا ـــــ کیونکہ ان سب کے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا ــــ اور وہ تھک ہار کر پھر خاموش ہوجاتا اور چپ کے سانپ کو ہونٹوں پر بٹھا کر اُسے اپنے سانس کا دودھ پلانے لگتا اور یوں امن ہوجاتا ــــ وہ جب تک اس جہان میں رہا خزانے کے چوکیدار کی طرح چُپ کے سانپ کو ہونٹوں پر بٹھائے رکھا ـــ کیونکہ وہ بول سکتا تھا ، وہ سوچ سکتا تھا اور لفظوں کے خزانے کا اُس جہان میں کوئی بیوپاری نہ تھا ۔

مگر آج یہ قہقہہ ، یہ ہنسی کہاں سے آگئی ؟

چُپ کی کوٹھڑی میں کس نے سیندھ لگا دی ؟

اُس نے ڈرتے ڈرتے ہونٹوں پر زبان پھیری ،

ہمیشہ کی طرح چُپ کے سانپ کی زبان نے

اس کی زبان کو نہ ڈسا

زہر کا ذائقہ بھی نہ آیا ۔

سانپ کے نرم جسم نے راستہ نہ روکا ۔

شاید وہ سانپ کہیں پیچھے ہی رہ گیا تھا ۔

اُسی جہان کے اندر

جہاں ان سانپوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔

اب اُس کے ہونٹوں پر کوئی پہرا نہ تھا ،

بولنے کے لئے آزاد

اُس کے لبوں کے مفرور نے اُسے آزاد کر دیا تھا ۔

تب وہ جی بھر کے ہنسا اور ہنستا رہا ۔

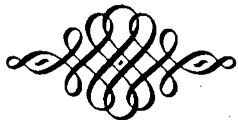
اُس نے گردن اُٹھا کر اوپر دیکھا ۔ دونوں گدھ اُس کے وحشی قہقہے کی کڑک سے سہم کر آسمان میں روپوش ہو چکے تھے ۔

وہ اس اُجاڑ میدان میں کیسے پہنچ گیا ؟ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں !

تجھے کس کا انتظار ہے ؟

وہ کونسے ہاتھ ہیں جنہوں نے تجھے دھکیل کر یہاں پہنچا دیا ہے ؟

اُس نے اپنے اندر سے پوچھا اور دماغ کی زمین میں گڑے وقتوں کے ہَل کا زنگ آلود پھالا کُھبا اور چلنے لگا ، گہرا اور مسلسل ۔



٣

میں ایک بیک نمبر ہوں۔
اگر بندہ تیس برس سے اُوپر کا ہو جائے
تو بیک نمبر ہو جاتا ہے۔
مائی بوڑھیوں سے بھرا میدان۔
ایک گدھا، گدھا!
گدھوں کا اجتماع!
زندگی کے جوہڑ کی جونکیں۔
ایک سفید دیوار۔

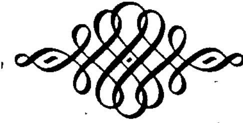
. . . .

اگلا نتین کی طرح،
ایک اُجاڑ ریتلے میدان میں،
میں ڈھونڈنے آیا ہوں، گم شدہ راستے۔
اور میں ان راستوں کو ڈھونڈھ نہ سکوں۔
میری آواز چاروں اَور اُڑان کرتی ہے
مگر مجھے کچھ بھی نہیں ملتا۔
اِس بے اَنت خلا میں،
اِس بے حساب خلا میں،
اس ریتلے میدان میں،
ریت، جو آنکھوں میں چُبھتی ہے۔
موت کی طرح سیاہ ریت۔
ریت، زمین کے کناروں تک پھیلی ہوئی
اور پھر — ایک آواز!
میں اُس آواز پر کان لگا دیتا ہوں،
خون خشک کر دینے والی — مگر دلکش۔
آواز کہتی ہے،
تمہارا قیاس ہے —
کہ تم ایک گم شدہ روح ہو؟
تمہارا خیال ہے کہ تم ایک روح ہو؟
تم بھولتے ہو۔
تم روح نہیں ہو
تم گمشدہ بھی نہیں ہو،
تم —
کچھ بھی نہیں

تمہارا کوئی وجود نہیں ——

لیکن بندہ اچانک ہی تو اُجاڑ میدانوں میں گمشدہ راستے تلاش کرنے کے لئے نہیں آجاتا۔ اُس کی روح ازل سے تو ہرسو اُڑان نہیں کرتی۔ وہ پیدا ہوتے ہی تو اس بے حساب خلا میں بھٹکنے نہیں لگتا۔ ہمیشہ سے بیک نمبر نہیں ہوتا۔ وہ تو یہاں تک حیاتی کے آدھے کھیت میں ہل چلا کر پہنچتا ہے —— یا پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہاں اور وہاں کے درمیان لمحوں، دنوں اور برسوں کے نالے، نہریں اور دریا ہوتے ہیں جنہیں عبور کر کے وہ یہاں تک پہنچتا ہے۔ پیچھے مُڑ کے دیکھے تو حیاتی کے کھیت میں کہیں کہیں ہریاول کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور باقی زمین بنجر اور بے آباد ہوتی ہے۔ وہ انہی اِکّا دُکّا ہریاول کے ٹکڑوں کی باس اپنے اندر اُنڈیلتا ہے اور آنے والے دکھوں کو سہنے کا چارہ کرتا ہے۔

میدان میں کھڑے بندے کو اپنی حیاتی کی کلر زدہ زمین میں ہریاول تلاش کرنے کی خاطر بہت دور تک جانا پڑا۔ وہاں تک —— جہاں ایک گاؤں تھا، جب وہ پانچ برس کا ایک بچہ تھا۔ بیک نمبر نہیں تھا۔



۴

نارمل سکول گاؤں سے خاصا دور تھا۔
خاکروبوں کی ٹھٹھی سے پرے۔
جوہڑ کے دوسری جانب
برسیم کے کھیتوں میں سے گذر کر
ریلوے لائن کے پار۔

لیکن پیٹ ہیں (بسکٹ، بسکٹ۔ ڈنڈالے کے ڈِڈھ کُٹ) پیٹ میں تنور کی باسی روٹی اور سجرے مکھن کی گرمائی اُس کے بدن کو اس طرح حدّت دیتی کہ وہ نارمل سکول تو کیا دس کوس دور شہر تک بھی چلتا جاتا تو اُسے بالکل تھکاوٹ نہ ہوتی۔ اس کی ناک گھر اور سکول کے درمیان پھیلی بوؤں اور خوشبوؤں سے اتنی مانوس تھی کہ اگر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی تو بھی وہ خاکروبوں کی ٹھٹھی کے باہر دھوپ میں سوکھتی کھالوں کی بُو، جوہڑ پر تیرتی کائی کی گیلی باس، برسیم کی ہری خوشبو سونگھتا، گندی نالیوں میں کلکاریاں مارتی بطخوں کی کیں کیں اور ریلوے پھاٹک پہ بجتی گھنٹی

کی ٹن ٹن سنتا، آنکھ مچولی کھیلتا سکول پہنچ جاتا۔ ویسے صرف پٹی باندھنے کی کسر تھی ورنہ وہ تو ہمیشہ اپنے آپ میں مگن، اَدھ کھلی آنکھوں سے صرف خوشبوؤں کے سندیسے سونگھتا سکول پہنچ جاتا تھا۔

آج بھی اُس کے نتھنوں نے دھوپ میں سوکھتی مردہ ڈنگروں کی کھالوں کی بُو اسے پہنچائی اور وہ تیز تیز چلتا خاکروبوں کی ٹھٹھی میں سے باہر نکل کے کھلے کھیتوں میں آگیا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ چھوٹی سی پگڈنڈی پر جاتے ہوئے اُس کی عادت تھی کہ وہ اپنی تختی اوس میں بھیگی ہوئی برسیم پر مارتا ہوا چلتا۔ پہلے تو تختی پر اوس کی لکیریں اس طرح نمودار ہوتیں گویا اُس پر کسی نے بھیگی ہوئی چھمک ماری ہو۔ پھر کالی سیاہی سے لکھے ہوئے لفظ اس طرح بڑے ہوتے جاتے۔ جیسے پہلے آنسو سے آنکھوں میں لگا کاجل اپنے گھر سے باہر پھیلنے لگتا ہے۔ سکول پہنچتے پہنچتے تختی پر لگی گاچی اور سیاہ لفظ اپنی علیحدہ شناخت گم کر بیٹھتے۔ پھر وہ اپنی تختی سکول کے کنویں کے حوض میں ڈبو کر اچھی طرح مل مل کے دھولیتا (اس حوض میں ایک چھوٹا سا مینڈک رہتا تھا جو ہمیشہ پھدک اُس کی تختی پر آ بیٹھتا اور اپنی گول گول آنکھوں سے اُسے انتہائی سنجیدگی سے دیکھتا رہتا) اس کی تختی کا ایک کنارا جھڑا ہوا تھا (یہ جو ہنجرا کے باغ میں سے گذرتے ہوئے وہ تختی پکے ہوئے امرودوں پر پھینکتا، ایک آدھ امرود اُس کی پھیلائی ہوئی جھولی میں آگرتا اور ساتھ ہی تختی بھی —— کنارا اِسی طرح ٹوٹا تھا)۔

آج بھی جب وہ کھیتوں میں سے گذر کر اُس بند پر چڑھا جس پر ریلوے لائن تھی تو اُس کی تختی برسیم کے پودوں پہ گہری اوس سمیٹ سمیٹ کر نچڑ رہی تھی —— ریلوے لائن کالے سانپوں کے ایک مست جوڑے کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے آنکھوں پر دونوں ہاتھوں سے سایہ کیا اور دائیں بائیں دیکھا —— کہیں گاڑی تو نہیں آرہی؟

پھر وہ لائن کے ساتھ لیٹ گیا اور کان اس کے ٹھنڈے لوہے کے ساتھ لگا دیا —— شاں شاں کے شرلاٹے کی انتہائی مدھم گونج، لائن میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔ جو صرف کان نے محسوس کی —— گاڑی پچھلے سٹیشن سے چل دی تھی۔ اُس نے تختی اور بستہ ایک طرف رکھا اور دونوں ہاتھ پَروں کی طرح پھیلائے کسی بازی گر کی طرح لائن پر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ اس مشغلے سے اُکتا گیا اور بیٹھ کر ایک پیسے کا وہ سکہ ڈھونڈنے لگا جو کل سکول سے واپسی پر اُس نے لائن کے اوپر رکھا تھا۔ وہ کبھی کبھار ایک پیسے کا سکہ لائن پر رکھ جاتا، دوسرے روز آتا تو سکہ گاڑی کے پہیوں تلے آکے ایک چوڑا بتاشہ بنا ہوتا۔ اس نے اپنے گھر کی پچھلی کوٹھڑی میں ایک گھڑے کے اندر ایسے چپٹے سکوں کا ڈھیر چھپا رکھا تھا —— کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ اُس گھڑے میں کتنا بیش قیمت خزانہ پوشیدہ ہے —— مگر آج لائن بالکل خالی تھی۔ اُس نے بہت تلاش کی مگر سکہ نہ ملا۔

"ضرور گامے ماچھی نے اُٹھا لیا ہے" اس نے گامے کو "کھوتے کا کھُر" جیسی گندی گالی دی اور پھر چار پانچ گول گول پتھر تلاش کر کے لائن کے اوپر ایک قطار میں رکھ دیئے (آج اُس کی جیب خالی تھی۔ جیب خرچ کے دونوں پیسوں سے وہ گاچنی اور قلم خرید چکا تھا) اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے بستہ اُٹھایا، اور تختی بغل میں داب کر لائن کے پار اُتر گیا۔

دوسری جانب ایک خالی میدان تھا۔ جس میں کہیں کہیں آک کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ عنابی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول دینے والے آک۔ اُس نے پھر حسبِ معمول تختی اور بستہ زمین پہ پھینکا اور کولہوں پہ ہاتھ رکھ کر آس پاس نگاہ دوڑائی، آک کی بڑھیاں دبوچنے کے لئے —— لیکن آج میدان خالی پڑا تھا۔ آک کے پودوں پر ایک بھی بڑھیا نہیں اُڑ رہی تھی۔ جہاں ہمہ وقت سفید بالوں والی

یہ روحیں ڈوڈے کے جسم سے نکل کر چاروں اور پھیلی ہوتی تھیں، وہاں آج کچھ بھی نہ تھا۔ پودوں پر جیسے ہوا رُکی ہوئی تھی اور اُن کے ڈوڈوں میں پنہاں بڑھیاں اپنے سفید بالوں سمیت سو رہی تھیں، باہر نہیں آ رہی تھیں —— آزردہ ہو کر وہ تختی اور بستہ اُٹھانے کو تھا کہ اَک کے پودوں کے بیچ اُسے ایک جسم ہلتا ہوا نظر آیا۔

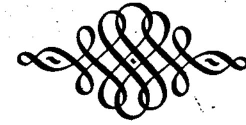
اُس نے قریب ہو کر دیکھا۔

ایک گدھا تھا۔

اوندھے منہ پڑا ہوا،

جیسے کچھوا اوندھا ہو جائے تو پھر سیدھا نہیں ہو سکتا۔

(جوہڑ میں بڑے بڑے کچھوے تھے جن کے جسموں میں اُس کی مچھلیاں پکڑنے والی درجنوں کُنڈیاں دفن تھیں —— کھوتے کے کھر کچھوے!)



۵

وہ اور قریب ہوا، غور سے دیکھا ——

گدھے کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔

"شائد سڑک پار کرتے ہوئے کسی ٹرک تلے آ گیا ہے ——"

ٹانگ صرف ٹوٹی ہوئی نہیں تھی

بلکہ گھٹنے سے نیچے بالکل ہی کچلی گئی تھی

(جیسے بیلن میں گنّا)

ویسے بھی بہت ہی نحیف اور لاغر

ہڈیاں ہی ہڈیاں۔

پہچان —— اُس نے گدھے کو پہچان لیا

(راجے جولاہے کا گدھا جس پر وہ سُوت لاد کر منڈی لے جاتا تھا۔)

وہ کبھی کبھار کسمسا کر سیدھا ہونے کی کوشش کرتا مگر۔

کچلی ہوئی ٹانگ میں اب ہڈی نہ تھی۔

ہڈی کے ریزے تھے جن کی
خون آلود چونچیں گوشت میں سے
باہر آ رہی تھیں
اور وہ سیدھا ہونے کی کوشش میں
پھر اوندھا ہو جاتا

....

کچھ فاصلے پر —— دو گدھ!
گنجی، لمبی گردنیں آسمان کی طرف ——
یوں انجان بنے بیٹھے تھے جیسے ——
وہ یونہی چہل قدمی کی خاطر ادھر آ نکلے ہوں
اور اُنہیں اس اوندھے پڑے گدھے سے
کوئی سروکار نہیں
کوئی واسطہ نہیں
کوئی دلچسپی نہیں۔

اس نے ایک کنکر اُٹھا کر گدھوں کی جانب پھینکا مگر وہ کبڈی کے کسی کھلاڑی کی طرح اپنے جسم لچکا کر غچہ دے گئے (ایک لمحے کے لئے پَر پھیلائے اور پھر انہیں سمیٹ کر ویسے ہی بیٹھ گئے۔)

"رحماں جولاہا جانے اپنے گدھے کو یہاں کیوں چھوڑ گیا ہے؟" اُس نے تختی اور بستہ اُٹھایا اور سکول کی جانب چل دیا (اس وقت اُسے معلوم نہ تھا کہ جب کوئی بھی جاندار ناکارہ ہو جائے تو اُسے لوگ یونہی ویرانوں میں پھینک دیتے ہیں)

تختی حوض میں ڈوبی تو مینڈک کا بچہ پھدک کر اُوپر بیٹھ گیا۔ اُس نے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مگر رحمان اپنے گدھے کو وہاں کیوں چھوڑ گیا ہے؟"

ایک دُونی دُونی —— دو دُونی —— تین ایکم تین —— تین دُونی ——

آمنے سامنے کھڑے بچوں نے کندھے اور بازو ہلا ہلا کر پہاڑے یاد کئے اور دوپہر تک اُن کے گلے بیٹھ گئے —— وہ بھی اپنا منہ تو "اِک دونی ....." کہنے کے لئے کھولتا مگر اسے محسوس ہوتا جیسے تمام بچے منہ کھول کر دہائی دے رہے ہیں —— ایک گدھا، گدھا —— دو گدھ، گدھ —— ایک گدھا —— ظہر کی اذان کے ساتھ ہی چھٹی ہو گئی اور وہ پُورنوں سے بھری تختی بغل میں دابے سکول سے باہر آ گیا۔

گاؤں کے راستے میں میدان تھا۔
میدان میں آک کے پودے تھے۔
اور اُن کے درمیان ——
اُجے جولاہے کا گدھا پڑا ہوا تھا۔
مگر اب آک کے پودوں پر ہوا گنجان تھی،
خالی نہ تھی۔
اُس میں اَن گنت سفید بڑھیاں اُڑ رہی تھیں کیونکہ ——
ڈوڈوں کے منہ کُھل چکے تھے
بڑھیوں کے سفید کفن کے سائے میں ——
اُجے جولاہے کا گدھا پڑا ہوا تھا
مگر اب ——
دو گدھ نہیں،

اُس کے گرد گدھوں کا ایک ہجوم تھا ——

اُن سب کی گردنیں آسمان کی جانب نہیں تھیں۔

ایک ایسے نقطے کی جانب تھیں جہاں ——

ایک اور گدھ کا دھڑ دکھائی دے رہا تھا، گردن کے بغیر

کیونکہ اُس کی لمبی گردن تو گدھے کے لید کرنے والے سوراخ کے اندر گھسی ہوئی تھی۔

اور باقی سارے گدھ۔

اپنی باری کے انتظار میں تھے۔

. . . .

گدھ کی گردن گدھے کی پیٹھ میں سے پھسلتی ہوئی باہر نکلی ——

اُس کی چونچ میں ایک خون آلود بوٹی تھی ——

ایک جیتے جاگتے جانور کا ماس ——

اور اُس کی گنجی، لمبی گردن ——

خون کی سُرخی میں رنگی جا چکی تھی۔

وہ گِرج بوٹی سنبھالے پچھلے پاؤں چلتا ——

اپنے ساتھیوں کے ہجوم میں آ کھڑا ہوا۔

پھر اُن میں سے ایک اور گدھ ——

ہجوم سے الگ ہوا ——

گردن سیدھی کئے ——

وہ زخموں کے اُس سُرخ کنوئیں کی طرف بڑھا

جس کے اندر،

گدھے کا سانس لیتا ہوا ماس،

آنے والی چونچ کے ڈر سے ——

کانپ رہا تھا۔

گدھ کی چونچ قریب ہوئی،

گدھے نے اُسے دیکھ کر ہلنے کی کوشش کی —— لیکن ——

وہ ہل نہ سکا —— وہیں پڑا رہا۔

اس کی لید کرنے والی جگہ میں سے جیتے ماس کے ——

چھیچھڑے لٹک رہے تھے اور اُن میں سے ——

خون —— رِس رِس کر خشک مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔

گدھ کی گردن گدھے کے قریب پہنچ کر اس طرح لمبی ہونے لگی ——

جیسے ربڑ کی بنی ہوئی ہو ——

پھر اُس نے اپنی چونچ سیدھی کر کے،

ماس کی اس خون آلود سرنگ میں داخل کر دی۔

پہلے چونچ اندر گئی،

پھر مہین آنکھیں اور چھوٹا سا سر،

اور پھر لمبی گردن،

خون سے رِستے ماس میں پھسلتی ہوئی اندر چلی گئی۔

گدھے نے اپنے لاچار جسم میں

زور آور کی چونچ کو آگے بڑھتے محسوس کیا ——

تو وہ غریب

اس طرح اکڑ گیا

جیسے مر گیا ہو۔
لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ تو ——
آغاز ہے۔
ابھی تو اس چونچ نے پوری طرح اندر جانا ہے۔
اُس کے ماس میں پہنچنا ہے۔
اُس ماس کو اُدھیڑنا ہے ——

اور ——

جس لمحے ——
گدھ کی چونچ نے اُس کے اندر سے
ماس کا ایک نوالہ نوچا ——
تو گدھا تڑپا ——
ایسے تڑپا کہ ——
گدھ کا باہر والا جسم کا حصہ بھی گدھے کے ساتھ دوہرا ہو گیا
لیکن اب ——
اب تو نوالہ چونچ میں تھا (زور آور ایک مرتبہ اگر نوالہ چھین لیں تو وہ بے شک دوہرے ہو جائیں چونچ نہیں کھولتے)
کچھ دیر بعد ——
گدھ کی گردن پھسلتی ہوئی باہر نکلنے لگی ——
اور اُس کی گنجی گردن سیاہی مائل خون میں لتھڑی ہوئی تھی
اُس کی مہین آنکھوں پہ خون کے قطرے تھے اور
چونچ میں —— گوشت کا ٹکڑا —— جس میں

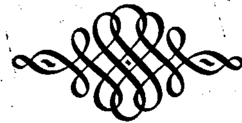
شاید ابھی جان باقی تھی
جو نا معلوم سا کپکپا رہا تھا ——
ایک اور گدھ آگے آیا — — —

گدھے کی آنکھیں ایسے پکھیروؤں کی مانند تھیں جن کی طرف موت کا جال بڑھتا ہے تو وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی پتھرا جاتے ہیں۔ اُسے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اُس روز —— اُس بڑھیوں سے بھرے میدان میں —— آک کے پودوں تلے اُس کے سامنے بندے کی زندگی کا مکمل ناٹک کھیلا جا رہا تھا —— اس سے بڑی اور کوئی سچائی نہ تھی —— گدھوں کا ہجوم اور ایک جاندار —— گدھے کی پیٹھ میں سے رِستے لہو کے سُرخ بُلبُلے —— گدھوں کی چونچوں میں لہو سے لتھڑی بوٹیاں —— سرخی میں رنگی گردنیں —— گدھوں کے ہجوم سے شروع ہو کر گدھے کی پیٹھ تک پہنچتا ہوا سُرخ اور گیلا راستہ —— موت کا —— خوف کے سیاہ بگولے اس کی آنکھوں میں ناچے اور وہ تھر تھر کانپنے لگا —— یہ گدھا اتنے عذاب کیوں سہہ رہا ہے؟ —— مسجد والے مولوی صاحب کا رب کہاں ہے جو بڑا مہربان ہے جو رحم کرنے والا ہے —— اگر یہ گدھ میری طرف آجائیں اور میری پیٹھ میں گردنیں گھسیڑ کر میرے اندر کی بوٹیاں نوچ لیں تو؟ —— اس نے پہلے ایک بڑا سا کنکر اُٹھا کر گدھوں کے ہجوم میں پھینکا —— اس مرتبہ انھوں نے پَر پھیلانے کی زحمت بھی گوارا نہ کی، بس اِدھر اُدھر ہو گئے —— کیونکہ اُن کے پیٹ بھرے ہوئے تھے) اُس نے مزید چار پانچ کنکر اُن کی جانب پھینکے مگر وہ لاپرواہ بیٹھے رہے۔ پھر وہ تختی کا دستہ مٹھی میں مضبوطی سے بھینچ کر گدھوں کے ہجوم میں گھس گیا۔

"کھوتے کے کھُر —— کھوتے کے کھُر ——" وہ چیخنے لگا ——
تختی گدھوں کے پَروں پہ پڑتی اور پھسل جاتی اور وہ وہیں اطمینان سے

بیٹھے رہتے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ گدھ وہاں سے اُڑ جائیں مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اُس نے گدھے کی جانب دیکھا ___ ایک گدھ کا دھڑ، گردن کے بغیر، گدھے کی پیٹھ میں اس طرح جڑا ہوا تھا جیسے وہ دونوں اسی طور پیدا ہوئے تھے ___ گدھا اور ایک دھڑ ___ وہ بھاگتا ہوا اُن کے قریب گیا اور گدھ کے دھڑ کو پوری قوت کے ساتھ اپنی تختی سے کوٹنے لگا ___ مگر کہاں! اندر گدھے کے اندر، چونچ نے نوالا توچ رکھا تھا وہ کیسے کھُلتی ___ وہ پاگلوں کی طرح گدھ کے دھڑ کو تختی مارتا رہا مگر اُس نے گردن باہر نہ نکالی ___ اور بالآخر جب گردن باہر آئی تو چونچ میں سُرخ بوٹی تھی ___ گدھا اب اتنا نحیف ہو چکا تھا کہ اپنا ماس کاٹتی چونچ کو محسوس کرنے کے باوجود بس وہیں پڑا رہا، حرکت کئے بغیر،

ایک گدھ نے اُس کی پیٹھ پر چونچ ماری (کیونکہ اب اُس کی باری تھی اور وہ اُس کے اور گدھے کے درمیان حائل تھا) اُس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا ___ گدھ گردن لامبی کئے انتظار میں تھا ___ اُس نے ایک مرتبہ پھر چونچ آگے بڑھائی ___ یہ گدھ میری پیٹھ میں چونچیں گھسیڑ کر میری بوٹیاں بھی نوچ لیں گے ___ اُس نے تختی وہیں پھینکی اور اندھا دُھند بھاگتا ہوا میدان سے باہر آگیا۔



٦

یہ گدھ میری پیٹھ میں چونچیں گھسیڑ کر میری بوٹیاں بھی نوچ لیں گے ___
اُس نے تختی وہیں پھینکی اور اندھا دُھند بھاگتا ہوا میدان سے باہر آگیا ___ اور پھر اس میدان میں آگیا؟

نہیں ___
ابھی نہیں ___
ابھی تو گدھوں کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی۔
ابھی تو آغاز ہوا تھا۔
ابھی تو ان گنت گدھ
اس کی حیات کے آسمان پر
اپنے بدصورت پَر پھیلا کر
اُسے سیاہ کریں گے
اِن گدھوں کی شکل ___

اُن گدھوں کی مانند نہیں تھی
جنہوں نے احمد کے گدھے کو سُرخ چیتھڑے بنایا تھا مگر ——
انہوں نے بندے کے ساتھ سلوک ویسا ہی کیا۔
اُس کا جیتا جاگتا ماس کھایا۔
اُس کے لہو سے اپنی گردنیں سُرخ کیں۔
بندے کو پہلے پہل وہ گدھ دکھائی نہیں دیتے تھے بلکہ ——
اپنے جیسے ہی بندے دکھائی دیتے تھے ——
آس پاس کی خلقِ خدا کی طرح ——
اشرف المخلوقات ——
اس وقت تو وہ صرف دوست تھے ——
رشتے دار۔ سرکاری افسر۔ سیاستدان۔ کاروباری
اور ادیب تھے ——
گدھ نہیں تھے۔
گدھوں کا روپ تو انہوں نے بعد میں دھارا
وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ۔
نرم پَروں میں سے سان پر لگی چھری جیسی چونچیں نکلیں۔
اور چمکیں۔
لیکن تب تک وقت گذر گیا تھا ناں ؟
کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
انہوں نے اُسے نوچ ڈالا
دیس، دوستی اور رشتے داری کے
کُند ٹکوں سے اُسے ——
ذبح کر ڈالا۔

— — — — —

اُس کا بدن ٹھنڈا ہونے لگا
اُس نے دل میں روشن سائیں کے پَج سے کہا
"اپنا الاؤ میرے پاؤں کی جانب بھیج
پالا میرے اندر کوچ کرنے کے لئے پھر زور لگا رہا ہے"
سائیں کے پَج نے ہمیشہ کی طرح پالے کا راستہ روک لیا اور پوچھا ——
"کب تک ؟"
"مزید کب تک ؟"
بندے نے کہا
"بس تھوڑی دیر اور . . . "
"اب زیادہ دیر نہیں ——"
اُس نے ویرانے میں کھڑے اپنے بیلی ٹنڈ کی جانب دیکھا —— وہ ہمیشہ کی طرح بازو پھیلائے چُپ کھڑا تھا —— کسی صلیب کی مانند ——
بندہ دل ہی دل میں ہنسا
"میں تو اُس جہان میں اپنی صلیب آپ اُٹھائے پھرا ہوں —— صرف اپنی نہیں —— ساری مخلوق کی صلیبیں بھی میری کمر پر لاد دی گئیں۔ پھر اس ویرانے میں لئے ایک اور صلیب کی کیا ضرورت تھی"
"یہ ٹنڈ مُنڈ درخت اگر آک کا پودا ہوتا —— اس کے ساتھ ڈوڈے لگتے —— ڈوڈوں میں سے لاکھوں بُڑھیاں جنم لیتیں اور اس میدان کے اکلاپے

میں نیم پاگل فقیرنیوں کی طرح اُڑنے لگتیں ــــ لیکن ــــ لیکن بُڑھیاں تو صرف
اُن میدانوں پر اپنے سفید بال کھولتی ہیں جن کے درمیان اچھے جولاہے کے گدھے
پڑے ہوتے ہیں ــــ جہاں گدھوں کے ہجوم ہوتے ہیں ــــ نہیں یہ ٹنڈک کا
پودا نہیں بننا چاہیئے ــــ اسی طرح بہتر ہے خشک اور پتوں پھولوں کے بغیر ــــ
ایک صلیب کی طرح ــــ"

ذہن کی زمین میں چلتا ہل ــــ جو چند لمحوں کے لئے باہر آگیا تھا۔ پھر نیچے اُترا
اور گذرے زمانوں کی گہرائی میں کھُب کر انہیں دیکھنے لگا۔

- - - - - - -

گاؤں اور دریا کے درمیان بیلا تھا۔
شیشم۔ توُت۔ جھڑبیریاں، سفیدے اور کریر کے جھنڈ۔ گنجان درختوں تلے
گیدڑوں، بھیڑیوں اور سوؤروں کی پناہ گاہیں پوشیدہ تھیں۔ ویسے تو بابا جہان خاں
ایک مرتبہ قسم کھا کر یہ کہہ چکا تھا کہ اُس نے کچھ برس پیشتر بیلے میں ڈنگر چراتے
ہوئے ایک شیر کو بھی دیکھا تھا، مگر کسی نے بھی اس چشم دید شیر کی موجودگی کو سنجیدگی
سے نہ لیا کیونکہ بابا کے "کچھ برس"، جانے کتنے تھے ــــ بیس، چالیس، ساٹھ ــــ
اس کی بے حساب عمر کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہ تھا ــــ ساٹھ، اسّی، سو یا اس
سے زیادہ۔ وہ سکول سے سیدھا گھر واپس آتا اور کوٹھڑی میں گھس کر اس کا دروازہ
بند کر لیتا اور اپنے چپٹے سکّوں کے خزانے کی گنتی میں مصروف ہو جاتا۔ گھڑے میں
ایک اور سکّہ ڈالتا اور پھر سوکھی روٹی کے دو چار نوالے لسّی کی مدد سے حلق سے اُتار
کر بیلے کی جانب چل دیتا ــــ بیلا اُس کا بیلی تھا اور وہ بیلے کا بیلی ــــ بیلے کے
بیچوں بیچ ایک کچا راستہ تھا جو ہمیشہ دھول سے اٹا رہتا۔ گاؤں کے لوگ
مویشی چرانے کے لئے دریا کے دوسرے کنارے جاتے تو اس کچے راستے سے
اُن کا گذر ہوتا۔ راستے کی اِس تختی پر جانوروں اور انسانوں کے پاؤں کے پوُرنے
لکھے جاتے مگر یہ پوُرنے کبھی پکے نہ ہوتے، اُن پر سدا نئے قدم اور سُموں کے
نشان ظاہر ہوتے رہتے ــــ شہر کی عدالتوں میں تاریخیں بھگتنے والے بھی اسی راستے
کو اختیار کرتے اور دریا کے کنارے پر پہنچ کر رلی ملاح کی کشتی کے ذریعے پار اُترتے۔
وہ بھی اِس راستے پر چلتا مگر کچھ دور جا کر شیشم کے ایک جھرمٹ میں سے دائیں
طرف ہو کر بیلے کے اندر داخل ہو جاتا۔ ادھر کسی راستے کا نام و نشان نہ تھا، زمین
کی تختی بالکل صاف اور کوری تھی، بس کریر اور جھڑبیریوں کے جھنڈ تھے ــــ دوب
اور گھاس پھونس ــــ یا کہیں کہیں مرے ہوئے پکھیرو، ہزاروں چیونٹیوں میں دفن،
دور سے ہلتے ہوئے معلوم ہوتے جیسے اُڑنے کا چارہ کر رہے ہوں۔
اسوج اور کاتک کے مہینوں میں کریر پر پیازی پھول کھلتے۔ سارے بیلے
میں انگاروں کی چادر بچھ جاتی ــــ پھولوں سے ڈیلے بنتے اور پھر ڈیلے پینجوؤں
میں بدل جاتے۔ سُرخ رنگ کے یہ پینجو اُسے بیروں سے بھی زیادہ ذائقہ دار لگتے
آج بھی اُس نے جیب میں بہت سارے پینجو بھر لئے۔
بیلے میں ایک ایسا مقام بھی تھا جہاں درختوں کے سائے اتنے گھنے تھے کہ اُن
کے نیچے بھری دوپہر میں بھی ایک نیم تاریکی خوابیدہ رہتی۔ وہ اس جگہ پہنچ کر ماتھے سے
پسینہ پونچھتا اور تختی اور بستہ زمین پر رکھ کر گھاس پر لیٹ جاتا ــــ یہ اس کا گھر تھا ــــ
اُس کا اپنا گھر ــــ جس میں اور کسی کا عمل دخل نہ تھا ــــ اس گھر میں ماں باپ، بہن
بھائی کوئی بھی اس کا شریک نہ تھا ــــ سفر کی تھکاوٹ کا بوجھ اُتارنے کے بعد
کبھی وہ شیشم کے درختوں پر چڑھ کر میناؤں کے گھونسلے تلاش کرتا، جنگلی چوہوں
کے بلوں میں پانی ڈال کر اُن کی بھاگ دوڑ کا تماشہ دیکھتا۔ ایک مرتبہ ایک بل میں
سے چوہے کی بجائے سانپ کا سَر نمودار ہو گیا اور وہ تختی بستہ وہیں چھوڑ کر گاؤں

بھاگ گیا تھا) اور اگر کوئی بھولا بھٹکا خرگوش اُدھر آنکلتا تو اُس کے پیچھے دوڑ لگا دیتا —— اِن مشاغل سے فارغ ہو کر وہ اطمینان سے تختی لکھنے بیٹھ جاتا اور جونہی سورج غروب ہونے کو آتا وہ اپنا گھر چھوڑتا —— اور دوسروں کے گھر واپس آجاتا۔

اُس روز بھی وہ اپنے اس گھر میں بیٹھا تختی لکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ پہاڑے بھی یاد کر رہا تھا کہ اچانک اس کے سامنے کا کریر اِس طرح ہلنے لگا جیسے بھونچال آرہا ہو۔ درختوں میں سوئے ہوئے پکھیرو پھڑپھڑاتے ہوئے شور مچانے لگے۔ کچھ دیر بعد دو کالے سؤر کریر کی جھاڑی میں سے لوٹ پوٹ ہوتے باہر آگرے اور اپنی کریہہ النظر تھوتھنیوں سے آپس میں بھڑنے لگے —— دہشت کے مارے اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور اس کا جسم کانپنے لگا۔ اس کی نظریں سؤروں پر ہی جمی رہیں اور اُس نے آہستہ سے اپنا بستہ اُٹھایا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ دریا کے کنارے پر پہنچتے پہنچتے وہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا اور اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا ——

کرملی ملاح اپنی جھگی کے باہر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور اس کی نظریں دریا کی سطح پر بچھی ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے ملاح کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ کرملی نے حقے کا ایک طویل کش کھینچا اور بولا "چاچا بھی ساتھ ہے؟"

اُس نے سر ہلایا۔

"دو سیر کا سر ہلاتے ہو اور چھٹانک بھر کی زبان نہیں ہلا سکتے؟" کرملی نے اُس کی کمر تھپکی اور ہنسنے لگا۔

اُس نے کرملی کو بیلے میں سؤروں کی کشتی کا قصہ سنایا اور پھر چپکا بیٹھ گیا۔

"یہیں بیٹھے رہو بیٹا —— شام کو دونوں چچا بھتیجا اکٹھے ہی گاؤں کو لوٹ چلیں گے۔"

کرملی نے پھر پانی پر نظریں بچھا دیں —— یوں لگتا تھا۔ جیسے یہ عمر رسیدہ ملاح بھی رسدھارتھ کی طرح پانیوں کی بولی سمجھتا ہے —— پانی کی آواز سن سکتا ہے قدرت کے سارے بھید پانیوں سے پوچھ لیتا ہے اور اپنی آپ بیتی اپنے سامنے بہتے ہوئے جاندار کو سنا لیتا ہے —— سوال جواب کر سکتا ہے۔

اُس کے سامنے کرملی کا مچھلی پکڑنے کا جال ریت میں گاڑے دو شہتیروں کے درمیان اس طرح تنا تھا کہ اُس کے سوراخوں میں سے دریا کا پانی جھانکتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ انگشتِ شہادت سیدھی کر کے جال کے سوراخ گننے لگا —— ایک —— دو —— تین —— چار —— کبھی کبھار سورج کی چمک پانیوں سے الگ ہو کر سوراخوں میں سے اُمڈ آتی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ گیلی مہتابی کے پھسپھسے شراروں ایسے تارے ناچتے اور دُھوپ کی سفید مچھلیاں پورے منظر میں تیرنے لگتیں۔

سات سو اکیاون سوراخ گننے کے بعد وہ گنتی بھول گیا مگر اس دوران دوپہر ڈھل چکی تھی، شام ہونے کو تھی۔ سورج آسمان سے اُتر کر دریا کے دوسرے کنارے پیتل کے ایک دمکتے تھال کی طرح کھڑا ہو گیا —— اب اس کے سامنے جال تھا اور جال کے سوراخوں میں پھنسا ہوا سورج کا سرخ تمتماتا چہرہ،

"چاچا" اُس نے آہستہ سے کرملی کا کندھا ہلایا "سورج جال میں پھنس گیا ہے۔ آؤ جلدی جلدی جال سمیٹ کر اُسے قابو کر لیں۔"

کرملی اُس کی یہ بات سُن کر ہنسا —— اور ہنستا رہا۔

"بتا —— اے سچ کے پیغمبر ——" کرملی پانی پر جھک گیا "کبھی سورج یوں بھی قابو میں آتے ہیں؟" اُس نے اپنا کان دریا کی جانب کیا اور آنکھیں بند کر لیں جیسے جواب کا منتظر ہو —— دریا بوڑھے سانپ کی طرح لیٹا ہولے ہولے

شُوکتا رہا۔ بیلے میں سے کسی گیدڑ کی آواز سنائی دی۔

"نہیں ___ ایسے نہیں" حُقّے کی نال زبان تلے دابے کرمّی جانے کس سے مخاطب ہوا" اگر سُورج یوں قابو میں آجائیں ___ گرفت میں آجائیں تو آج میری تاریک جُھگی میں روشنی ہی روشنی ہوتی ___ کونے کھدروں میں سورج ہی سورج چمکتے"

اُس شب جال کے سوراخوں میں سے جھانکتا سورج اُس کے ذہن میں پناہ گزیں ہوگیا۔

اس کا چاچا گاؤں کی بیٹھک سے واپس آیا تو وہ کھیس میں منہ دیئے سو رہا تھا۔ کھیس کے اندر روشنی ہی روشنی تھی، اُس سورج کی جسے وہ آج جال کے سوراخوں میں قید کر کے پکڑ لایا تھا۔ آہٹ سے اس کی آنکھ کُھل گئی اور اُس نے کھیس منہ سے ہٹا کر پوچھا۔

"چاچا کیا میں کبھی سورج کو حاصل کر سکتا ہوں؟"

چاچے نے حیرت زدہ ہو کر اُسے دیکھا اور ہولے سے بولا۔

"سیانے لوگوں کا قول ہے کہ اگر بندہ جی لگا کر محنت کرے، ارادہ مضبوط رکھے تو وہ اِس جہان کی ہر شے کو حاصل کر سکتا ہے"

"ہر شے کو چاچا؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اگر میں خوب محنت کروں، پوری سولہ جماعتیں پاس کر لوں اور میرا ارادہ نمبرداروں کی حویلی سے بھی اُونچا اور مضبوط ہو تو کیا میں سورج کو حاصل کر لوں گا!"

چاچا اُس کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔

"میں تو کم عقل ہوں ___ مجھے اُن باتوں کا کیا پتہ، پر سیانے تو یہی کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس طرح بندہ سورج کو بھی حاصل کر لیتا ہو"

اس نے دوبارہ کھیس منہ پر تان لیا مگر اُسی لمحے چاچے نے اچانک کھیس کا کونہ پکڑا اور اُس کے جسم سے اُتار پھینکا ___ "تم کہاں گئے تھے آج؟ ___ یہ خون کیسا ہے؟"

اُس کا بستر خُون سے نچُڑ رہا تھا۔ اُس نے اپنے لباس کو دیکھا تو وہاں بھی خون ہی خون تھا۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور اُس کا جسم اس طرح کانپنے لگا جیسے ماسٹر کا بید اُس پر برسنے والا ہو۔ "پتہ نہیں چاچا ___ میں تو آج بھی ہمیشہ کی طرح بیلے میں ہی گیا تھا ___ بے شک قسم لے لو ___ کرمّی ملاح سے پوچھ لو"

"بیلے میں ___ کہیں جوہڑ میں سے تو نہیں گذرے؟"

اُسے یاد آیا کہ گاؤں لوٹتے ہوئے کرمّی اور وہ جوہڑ میں سے گذر کر آئے تھے ___ اپنے کپڑے اُتار کر انہوں نے سر پر رکھ لئے تھے ___ جوہڑ کے اوپر سے ہو کر گاؤں آتے تو فاصلہ زیادہ پڑتا ___

"ہاں چاچا" اُس نے ڈرتے ڈرتے اقرار کیا "میں جوہڑ میں سے گذرا تھا"

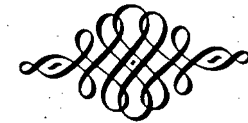
چاچے نے فوراً اُس کے سارے کپڑے اُتار دیئے اور پھر اُس کے ننگے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ جیسے کچھ ڈھونڈھ رہا ہو ___ ران کے اندرونی حصّے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس کی ہتھیلی تلے ایک ایسا نرم اور لجلجا ماس آیا جو اُس کے بیٹے کا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اُسے جلدی سے گھسیٹتا ہوا دالان میں روشن دیئے کی ناکافی روشنی تلے لے آیا۔ اُس نے جھک کر غور سے دیکھا ___ غباروں کی طرح پھولی ہوئی دو جونکیں اس کے بیٹے کا لہو پی پی کر حواس باختہ ہو رہی تھیں۔ ___ زور آور کی طرح صرف پیٹ بھر لینے سے اُن کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اپنی

خصلت سے مجبور انہوں نے اتنا خون چوسا تھا کہ وہ اُن کے اُبھرے ہوئے پیٹ میں سمانے کی بجائے اُن کی پیٹھوں میں سے خارج ہو ہو کر کچے فرش پر ٹپک رہا تھا۔ چاچے نے پہلے جونکوں کو انگلیوں کی مدد سے کھُرچا اور پھر مُٹھی میں قابو کر کے اُنہیں اُتار پھینکا۔

اُسے اب معلوم ہوا کہ شام کے بعد اُس کی رانوں کے اُوپر مدھم سی جلن کیوں ہو رہی تھی۔

دونوں جونکیں کچے فرش پر دھیرے دھیرے ہل رہی تھیں۔ اُن کے جسموں میں سے ابھی تک خون رِس رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُن کی جسامت پہلے سے آدھی رہ گئی اور ان کے ارد گرد خون کا ایک چھوٹا سا جوہڑ بن گیا۔

"اِن پھُولی ہوئی جونکوں میں میرا خون ہے ——" اِس خیال سے اُس کا چہرہ توری کے پھُول کی طرح زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بڑھیوں کے سفید بادل تیرنے لگے (اس وقت تک اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ اُس کے خون سے پھولی ہوئی جونکیں بھی حیاتی کے ناٹک کا ایک اور منظر ہیں —— گدھ اور اُس کا اندر —— جونکیں اور اس کا خون!)



٧

دوسرے گدھ نے پوچھا "وقت آگیا ہے —— یا نہیں؟"

پہلے گدھ نے نیچے دھیان کیا —— وہی بندہ —— وہی ٹنڈ منڈ درخت اور اُن کے چاروں اور اکلاپے کا راج —— "نہیں —— ابھی نہیں —— ابھی وقت نہیں آیا۔"

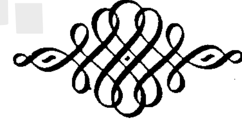
دوسرے گدھ نے گردن میں بل ڈالتے ہوئے غصّے سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ "لیکن وقت کب آئے گا؟ —— ابھی تو وہ اکیلا ہے —— اس بیابان میں بے شک دہائی دیتا رہے، اس کا گلا بیٹھ جائے مگر اُس کی آواز پہ کوئی دھیان نہ دے گا اس لئے کہ یہاں ہے ہی کوئی نہیں ....

لیکن کل کلاں اگر اُس کے ساتھی آگئے تو؟"

"ساتھی؟" پہلا گدھ مکّاری سے چیخا۔ "ارے احمق گدھ اگر اُس جہان میں اِس کا کوئی ساتھی ہوتا تو وہ اس بیابان میں کیوں آکھڑا ہوتا؟ —— یہ اکیلا ہے —— سدا اکیلا رہے گا —— اس کے لئے یہاں تک کوئی نہیں پہنچے گا۔"

"مگر مجھے بھوک لگی ہے —— میری گردن خشک ہو چکی ہے، اِسے تر کرنے کے لئے مجھے گاڑھا لہو چاہئیے ——"

"ابھی نہیں ——" پہلے گدھ نے اپنی سیانی چونچ کٹکٹائی "ابھی وقت نہیں آیا ——"



(۸)

بندے نے آسمان کی جانب دیکھا ——

دونوں گدھ اتنی لاپرواہی سے اُڑ رہے تھے، جیسے ——

وہ یونہی سیر سپاٹے کے لئے اِدھر آنکلے ہوں اور ——

انہیں میدان میں کھڑے بندے سے کوئی سروکار نہیں ——

کوئی واسطہ نہیں ——

کوئی غرض نہیں ——

"شکل سے وہی گدھ لگ رہے ہیں۔ جنہوں نے احمے کے گدھے کو نوچ کھایا تھا"

بندے کی مٹھی خود بخود بھینچ گئی —— لیکن وہ تو اپنی تختی آک کے پودوں والے میدان میں ہی چھوڑ آیا تھا —— ایک گدھا، گدھا۔

اُس کی ران پر نامعلوم سی جلن ہونے لگی —— جونکیں؟ وہ چونکا ——

وہ کون سے جوہڑ میں سے گذر کر آیا تھا —— حیاتی کے جوہڑ میں سے ——

لیکن اِس جوہڑ میں سے اُس کے علاوہ اور لوگ بھی تو گذرتے ہیں اور جونکیں
اُن کے ماس پر نہیں چمٹتیں ؟ ___ شاید اُس کے جسم میں کوئی ایسی باس تھی جو
جونکوں کو پاگل کر دیتی تھی اور وہ صرف اُسے ہی چمٹتی تھیں ___ لیکن یہ جونکیں گاؤں
کے جوہڑ میں پائے جانے والی جونکوں کی طرح دکھائی نہیں دیتی تھیں ___ وہ نظر نہیں
آتی تھیں ___ بے شک جسم پر اچھی طرح ہاتھ پھیر کر دیکھ لو، تم انہیں تلاش نہیں کر سکتے،
لجلجا ماس میں انگلی نہیں کھبتی ___ بس بدن میں ہلکی سی جلن ہوتی رہتی ہے اور
ساری حیاتی کا لہو آہستہ آہستہ چوسا جاتا ہے . . . . .

- - - - - - -

چاچے نے اُسے زمین گہن رکھ کر شہر بھیجا ___ ایک بیگھہ اور ایک جماعت
___ اِس طرح اُس نے سولہ جماعتیں پاس کر لیں (زمین ابھی تک گہن رکھی ہوئی
تھی۔ لیکن اب کیا فرق پڑتا تھا؟ ___ اس بیابان میں) چاچا جانے کن سیانوں کی
بات کرتا تھا کیونکہ اُس نے تو جی بھر کے محنت بھی کی، ارادہ بھی مضبوط رکھا مگر
سورج حاصل کرنا تو الگ رہا وہ تو اس جہان کی کمینی ضرورتوں کو بھی حاصل نہ کر سکا
روٹی، کپڑا اور مکان ایسی کمینی ضرورتیں ___ خالی ڈگری تو ایک ایسا بے مراد سا
کاغذ ہے جو صرف ہلدی اور نمک باندھنے کے کام ہی آ سکتا ہے ___ جب تک اُسے
رشوت، مکر، جھوٹ اور خوشامد کے پَر لگا کر بے ضمیری کی پھونکیں نہ ماری جائیں
یہ کاغذ نہیں اُڑتا . . . . محنت، قابلیت اور سچ تو اُس جہان میں پتھر کے پَر تھے
جنہیں انسان جسم کے ساتھ باندھ لے تو ڈوب سکتا ہے، اُڑ پھر بھی نہیں سکتا ___
ایک ہی جگہ پر کھڑا رہتا ہے ___ بالکل تنہا ___ لیکن جب اُسے یہ سب معلوم ہوا
تو وقت گذر چکا تھا ___

اُن دنوں اُس کا وجود سالم تھا . . . . اُسے اپنی عقل اور قابلیت پر بھروسہ تھا۔

اُسے یقین تھا کہ وہ پرواز کر سکتا ہے ___ اُس نے مقابلے کا امتحان دیا، اونچی سرکاری
نوکریوں کے لئے ___ نتیجہ نکلا تو وہ کامیاب ہونے والے پہلے دس نوجوانوں
میں شامل تھا۔ لیکن ابھی اُس کے اور سرکاری نوکری کے درمیان انٹرویو کا گہرا کنواں
تھا ___ دوستوں نے مشورہ دیا کہ ___

"سوالوں کے وہی جواب دینا جو انٹرویو لینے والے سننا چاہتے ہیں۔ وہ جو کہیں
کہنا سچ کہتے ہو۔ درمیان میں آپ نے درست کہا جناب، میں آپ سے اتفاق
کرتا ہوں سر کا وظیفہ پڑھنا۔ وارث شاہؒ، بلھے شاہؒ، میاں محمدؒ اور شاہ حسینؒ کا ذکر
بھولے سے بھی نہ کر بیٹھنا۔ گلے میں سارتر، جوائس ایلیٹ اور کیملے کی مالا پہن کر
بیٹھنا ___ مذہب پر بحث مت کرنا ___ اور بنیادی بات ___ اندر کا بھید مت
کھولنا۔ سچ کے پکھیرو کو قید ہی رہنے دینا"۔ وہ انٹرویو دینے کے لئے دروازے میں سے
داخل ہوا تو دوستوں کے تمام مشورے بھول گیا اور صرف چاچے کا کہا یاد رکھا ___ اگر
انسان محنت کرے، ارادہ مضبوط رکھے ___

انٹرویو شروع ہوا تو اُس کے سامنے چار بندے تھے، جوں جوں وقت گذرا اور
اُس نے صرف سچ اور صرف سچ کہا تو اُن بندوں کا لباس پَروں کی صورت پھڑپھڑانے
لگا، گردنیں لمبی اور گنجی ہونے لگیں، ناک اتنے نوکدار ہوتے گئے کہ بالآخر چونچیں
بن کر چمکنے لگے ___ وہ چاروں اب گدھ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سوال نہیں
پوچھ رہے بلکہ اُس کی بوٹیاں نوچ لینے کی جستجو میں ہیں ___ ایک گدھا، گدھا ___
چارہ گدھ، گدھ نتیجہ نکلا تو وہ فیل تھا ___ اگلے ماہ اُسے ایک پرائمری سکول میں نائب
مدرس کی نوکری مل گئی (دو سو روپے ماہوار میں وہ چاچے کی زمین گہن سے کیسے
چھڑاتا؟)

یہ گدھوں کا پہلا حملہ تھا۔ حیاتی کے جوہڑ میں سے گذرتے ہوئے چمٹنے والی

والی پہلی جونکیں۔

ـــــــ

سفید دیوار!
ایک سفید دیوار!
ویرانے میں ایک نئی سویر کا ظہور ہوا ـــــ
تو بندے نے دیکھا کہ اُس کے سامنے
زمین سے شروع ہو کر عرش تک
ایک دیوار کھڑی ہے،
ایک سفید دیوار۔
بندے کا بدن ـــــ
پسینے میں نہا گیا
"یہ دیوار یہاں بھی آ پہنچی ہے؟"
لیکن یہ ہو نہیں سکتا۔
یہ انہونی بات ہے ـــــ
اس ویرانے میں مجھے
کسی دیوار کی ضرورت نہیں ـــــ
انہی دیواروں سے بھاگ کر تو میں
یہاں آیا ہوں"
زمین کی کوکھ میں سے پھوٹ کر نکلتی ہوئی
عرش کے سینے میں گڑی ـــــ
ایک دیوار ـــــ

"یہ یہاں بھی آ پہنچی ہے؟" بندے کو یقین نہ آیا۔ "یہ تو میرے چھوٹے سے کمرے میں بقیہ تین دیواروں کے سہارے کھڑی تھی، دن رات مجھے اپنی سفید اندھی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔ اُس جہان میں تو یہ میری دوست تھی۔ لیکن اِس ویرانے میں تو مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر بھی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے ـــ اب کونسے راستے روکنا چاہتی ہے؟

دو چار پائیاں، ایک بک شیلف اور گھر گرہستی کا سارا سامان اُس چھوٹے سے کوٹھڑی نما کمرے میں میرے چاروں طرف بکھرا ہوتا تھا ـــ رات کو آنکھیں بند کرتے ہوئے یہ سفید دیوار آخری صورت ہوتی جو دکھائی دیتی (بقیہ تین دیواروں میں دروازوں اور کھڑکیوں کے زخم تھے ـــ تختی بالکل صاف ہو تو اُس پر خیالوں کے پُورنے لکھے جا سکتے ہیں) اور صبح آنکھ کھلتی تو بھی یہی سفید کفن چادر دکھائی دیتی۔ میری گھر والی کو جانے کیسے خبر ہو جاتی کہ میری آنکھوں سے نیند کے پکھیرو اُڑ چکے ہیں، میں جاگ چکا ہوں اور اُس کا منہ ہائی فائی کے ایک سپیکر کی طرح کھل جاتا۔

"آپ کی تنخواہ میں گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا
بچوں کے لئے دودھ کب تک ادھار آئے گا ـــــ
چینی بھی چاہیئے۔
سردی کی شدت ـــــ بچوں کے لئے
کم از کم چار سویٹروں کی ضرورت ہے۔
خواہ سفید چمڑی والوں کی اُترن ہو ـــــ تب بھی
پچاس روپے سے کم میں نہیں آئیں گے۔

بہن کی شادی ہے ـــــ میری بہن کی
اُسے جوڑا بھی دینا ہے۔
میں مشقت کرتے کرتے کمزور ہو گئی ہوں۔
ڈاکٹر نے طاقت کے ٹیکے لکھ کر دیئے ہیں۔
وہ بھی چاہئیں۔
پچاس روپے کمیٹی کے بھی دے دیں ـــــ آج ہی،
گھر واپسی پر سوجی لے کر آنا،
تین ماہ سے کوئی میٹھی چیز نہیں پکائی
بچے ضِد کرتے ہیں۔
اس ماہ مجھے کم از کم تین سو روپے چاہئیں۔
(مجھ سے بھی کوئی پوچھ لے کہ مجھے کیا چاہیے!)
دیوار کی طرف کیا دیکھتے ہو! ـــــ میری طرف دیکھو
میں کوئی پاگل تو نہیں جو یوں
بک بک کر رہی ہوں؟
سُن رہے ہو؟
تنخواہ میں گذارا نہیں ہوتا۔
کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے؟
سکول سے واپسی پر چارپائی پر بیکار پڑے رہتے ہو
بس کتابیں پڑھتے رہتے ہو۔
کتابیں! ـــــ میری سوکنیں ـــــ تمہاری سگی!
کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے؟

بس سٹاپ کے سامنے بیٹھا پان سگرٹ والا بھی ـــــ
تم سے زیادہ کمائی کر لیتا ہے
تم بس سٹاپ پر ـــــ
جواب کیوں نہیں دیتے؟
سفید دیوار کی طرف ہی دیکھتے جاتے ہو۔
جواب کیوں نہیں دیتے؟
تم سمجھتے ہو کہ میں اس طرح بولتی رہوں گی، بولتی رہوں گی
اور پھر بالآخر خاموش ہو جاؤں گی؟
میں خاموش نہیں ہوں گی۔
بولتی رہوں گی۔
اگر گھر والی کو شریفوں کی طرح رکھ نہیں سکتے تھے
تو شادی کیوں کی تھی؟
(شادی میں نے کی تھی؟)
بچے کیوں پیدا کئے تھے؟
(ہاں! میں قصوروار ہوں۔)
سنو، وہ میری جیسی ہی نصیبوں جلی ہوتی ہیں جو
بچوں سمیت
نہروں میں ڈوب مرتی ہیں۔
(کچھ میرا بھی خیال کرو ـــــ
میں کہاں جاؤں؟
میں کہاں ڈوب مروں؟)

وہ جبڑے سختی سے بھینچے سفید دیوار کو تکتا رہتا ـــــ بیک گراونڈ میں گھر والی
کی پھٹکار اور ـــــ سامنے سفید دیوار ـــــ وہ آنکھیں جھپکے بغیر سفید دیوار کی طرف
دیکھتا رہتا اور تھوڑی دیر کے بعد یوں محسوس ہوتا جیسے گھر والی کی آواز کہیں بہت
پیچھے رہ گئی ہے ـــــ اس کے کانوں میں پہنچنے سے پیشتر کہیں راستے میں ہی گم ہو گئی
ہے۔ جونکوں کی طرح کھبتی لعن طعن کی اذیت کہیں دور رہ گئی ہے ـــــ اور بالآخر
بندے کی آنکھیں اُس کے چہرے سے الگ ہو کر سفید دیوار کے ساتھ جا چپکتیں
ـــــ وہ وہیں چارپائی پر ہی لیٹا رہتا مگر اُس کی آنکھیں سفید دیوار پر چپکی رہتیں ـــــ
اور یوں اُس کی اپنی ہی آنکھیں اُسے دیکھنے لگتیں ـــــ دیوار کی سفید سکرین پر گئے
زمانوں کی مورتیں ایک فلم کی طرح حرکت کرنے لگتیں ـــــ طرح طرح کی من کو بھانے
والی مورتیں ـــــ اُن دنوں کی جب اُسے ابھی جونکیں نہیں چمٹی تھیں . . . . گدھ اُس
کے ماس کے بھوکے نہیں ہوئے تھے ـــــ گھر والی کی پھٹکار گہرے سمندروں میں
ڈوب جاتی اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی تتلی ہولے سے بیٹھ جاتی ـــــ وہ
سب کچھ بھول جاتا، جونکوں کی جلن اور گدھوں کی چونچیں ـــــ سفید دیوار پر لگی اُس
کی اپنی ہی آنکھیں اُس کے وجود پر ایک اور دن کے لئے زندگی کی پھونک مار دیتیں۔

- - - - - - -

لیکن اس ویرانے میں یہ سفید دیوار کہاں سے آ کھڑی ہوئی؟ مجھے تو اس کی
ضرورت نہیں کیونکہ یہاں کوئی آواز نہیں، کوئی لعن طعن اور پھٹکار
نہیں ـــــ یہاں تو میں بالکل اکیلا ہوں ـــــ لیکن نہیں یہ بھی سچ نہیں کہ وہ بالکل
اکیلا ہے ـــــ گھر والی یہاں بھی اُس کے آس پاس سانس لیتی تھی کیونکہ وہ یقیناً اس
وقت سوچ رہی ہوگی ـــــ وہ سوچ رہی ہوگی "کتے کے بچے نے میری اور بچوں
کی زندگی برباد کر دی ہے اور اب چلا گیا ہے ـــــ سور" پھر وہ کیونکر اکیلا ہو سکتا
تھا۔ وہ اس سے دامن بچا کے کہیں بھی نہیں جا سکتا تھا ـــــ مجھے اب تو سانس
لینے دو ـــــ میرے پھیپھڑوں کی طرف آنے والی ہوا کا راستہ نہ روکو ـــــ اگر تم
میرے جسم پر پنکھے کی ٹھنڈی ہوا کی طرح نہیں چل سکتیں تو کم از کم ایگزاسٹ فین
کی طرح میرے سانسوں کو ـــــ جو سانس باقی ہیں اُن کو تو چوس کر حیاتی سے باہر
نہ پھینکو ـــــ کہیں یہ تو نہیں کہ وہ اب بھی اُسی چھوٹے سے کمرے میں قید ہے،
اُسی سفید دیوار کی طرف رُخ کر کے چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔ وہ سفید دیوار جو اُس کی
دوست تھی ـــــ ایسی دوست جو خود تو خاموش رہے مگر تمہاری ساری گفتگو
بُت بنی سُنتی رہی ـــــ سفید بُت!

- - - - - - -

وہ کچھ کھائے پئے بغیر خاموشی سے گھر سے باہر نکل جاتا اور سائیکل پر سوار
ہو کر سکول چلا جاتا ـــــ ہر ساتویں آٹھویں روز گاؤں سے چاچے کا خط آتا۔

بیٹا، مجھے بخار آتا ہے۔
تمہاری ماں کھانسی سے بدحال ہے۔
زمین چھڑانے کا کوئی بندوبست کرو۔
کوئی حیلہ کرو۔
کچھ تو کرو۔
کچھ پیسے ہی بھیج دو۔
اپنی نیک کمائی میں سے
زکوٰۃ ہی نکال بھیجو۔
ہمارے پاس تو دو وقت کی روٹی کے لئے
بھی پیسے نہیں ہیں۔

نیک کمائی ! وہ خط پڑھ کر ہمیشہ ایک ہذیانی ہنسی ہنستا اور سر ہلاتے ہوئے ہنستا
ہی رہا۔

ویسے تو سکول سے دو بجے ہی چھٹی مل جاتی مگر وہ شام سے پہلے گھر نہیں لوٹنا
چاہتا تھا ـــــ وقت گذارنے کی خاطر وہ ایک ایسے چوراہے میں جا کھڑا ہوتا جہاں
سے گذر کر شہر کے سارے جنازے قبرستان کی طرف جاتے تھے ـــــ اب وہ جنازوں
کا ایکسپرٹ ہو چکا تھا ۔ اگر چار بندے پھٹی پرانی چادر میں لپٹے کسی مُردے کو چارپائی
پر یوں اُٹھائے چلے جا رہے ہوں جیسے اس کی لاش کو سڑکوں پر گھسیٹ رہے ہیں تو
ـــــ وہ کوئی فقیر ہے جو رات کو سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا ہے ۔۔۔۔ یا کوئی مزدور جس
کا کوئی والی وارث نہیں ہے اور اُسے اُس کی اپنی مشین نے پیس ڈالا ہے ۔
ایک مرتبہ وہ یونہی بے دھیانی میں ایک ایسے ہی جنازے کے ساتھ ساتھ چلنے
لگا ۔ چارپائی اُٹھانے والے اُسے گھور گھور کر دیکھتے رہے کہ یہ اکلوتا رشتے دار کہاں
سے آگیا ہے ۔ قبرستان پہنچنے پر جب وہ لاش کو ایک گڑھے میں پھینکنے لگے تو
اُس نے آگے بڑھ کر کہا " میں اِس کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں "
کارپوریشن کے خاکروبوں نے جو جلد از جلد اُس پر مٹی کی چند کدالیں ڈال کر گھر
لوٹنا چاہتے تھے اُسے ناگواری سے دیکھا اور چادر ہٹا دی ـــــ چہرہ ؟ ـــــ
پتہ نہیں وہ لاش کا چہرہ تھا یا جسم کا کوئی اور حصّہ ـــــ صرف ماس کی دلدل تھی ۔ جس
میں آنکھیں اور ناک ہموار کیچڑ کی طرح تھے ـــــ شاید یہ اُس کا پیٹ تھا ـــــ ایک مزدور
کا پیٹ ـــــ وہ نہ تو گورا تھا اور نہ سیاہ فام ـــــ اُس کے خون آلود چہرے (؟)
سے یہ تعین بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کونسے ملک کا باسی ہے ـــــ افریقہ کا ہے ،
ایشیا کا ہے یا امریکہ کا ہے ۔ بس ایک مزدور کا پیٹ تھا ـــــ ماس کی دلدل ۔
کچھ جنازے پھولوں سے لدے ہوتے ۔ موتیے ، گیندے اور گلاب کے عطر

کی خوشبو سے کاریں رُک جاتیں سائیکل سوار کھڑے ہو جاتے اور چوک کے درمیان
اپنے چبوترے پر کھڑا ٹریفک کا سپاہی نیچے اُتر کر ٹریفک روک دیتا ۔ ان جنازوں کے
پیچھے خلقت کا ایک سیلاب ہوتا ـــــ کسی دھن والے کا جنازہ جو قوم اور ملک کے غم
میں گھلتا گھلتا دل کی حرکت بند ہونے سے انتقال کر گیا ۔ اس قسم کے جنازوں میں شامل
افراد سر جھکا کر ایک ہی جگہ پر نہیں چلتے جاتے تھے بلکہ ساری مخلوق میں تڑپتے پھرتے
تھے ـــــ " بڑا افسوس ہے ۔۔۔۔ اللہ جنت نصیب کرے ۔۔۔۔ میاں صاحب
جیسے لوگ ۔۔۔۔ ہمارے تو ان داتا تھے ۔۔۔۔ ہم تو اُن کے خادم تھے ۔۔۔۔ اب آپ
کے خادم ہیں ۔۔۔۔ بڑا افسوس ۔۔۔ " اپنی موجودگی ریکارڈ کروانے کے بعد وہ ہمیشہ
اِدھر اُدھر ہو جاتے ـــــ اِن جنازوں میں قریبی رشتے داروں کے علاوہ بیشتر لوگ صرف
حاضری لگوانے آتے تھے بلکہ رشتے دار بھی ـــــ وہ بچوں ، بوڑھوں ، ماؤں ، باپوں ، بھائیوں
بیٹوں ، بیٹیوں کے جنازوں میں شامل لوگوں کے چہروں سے اندازہ لگا لیتا کہ ـــــ یہ
باپ ہو گا ـــــ کیونکہ اُس کے پاؤں گھسٹ رہے ہیں ـــــ یہ بھائی ہو گا ـــــ ننگے پاؤں
چلا آرہا ہے ـــــ یہ بیٹا ہے ، سیاہ عینک کے پیچھے آنسو گراتا ـــــ اور یہ حاضری
لگوانے والا ہے جو بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا ہے ـــــ وہ سوچتا کہ اگر کل کلاں میں
مر جاؤں تو میرے جنازے کے ساتھ کونسے لوگ چلیں گے اور کتنی دور تک چلیں
گے ـــــ بال کون نوچے گا ـــــ روئے گا کون کون ـــــ اور کون دو چار آنسو بہا کر
سگرٹ سُلگائے گا ـــــ

کئی مرتبہ چوک میں سے کوئی تانگہ گذرتا ۔ پچھلی نشست پر سروں پر رومال
لپیٹے دو تین آدمی میت اُٹھانے والی چارپائی کے پائے مضبوطی سے پکڑے ہوتے
وہ ذہنی طور پر اُس تانگے کا پیچھا کرتا اور حساب لگانے لگتا کہ ـــــ چارپائی موت والے
گھر میں پہنچ گئی ہو گی ـــــ اس وقت میت کو غسل دیا جا رہا ہو گا ـــــ اب کفن کی

گانٹھیں باندھ رہے ہوں گے ——— بس آدھ پون گھنٹے میں جس موڑ سے تانگہ نظروں
سے اوجھل ہوا تھا۔ وہاں سے کلمۂ شہادت کی آواز سنائی دے گی ——— اگر اتنی دیر
بعد جنازہ نمودار نہ ہوتا تو وہ سوچتا ——— ہاں بہنیں پاؤں نہیں چھوڑتی ہوں گی ———
کراچی سے بھائی نہیں پہنچ پایا ہوگا۔ قبر کے لئے مناسب جگہ کا انتظام نہیں ہوا
ہوگا ——— یا شاید گھر میں رقم نہیں ہوگی ——— قبر کی قیمت ادا کرنے کے لئے۔

وہ شام ڈھلے گھر واپس آتا اور ایک میت کی طرح بے حس و حرکت، چارپائی
پر لیٹ جاتا ——— سامنے سفید دیوار اور ——— پیچھے گھر والی کا ٹیپ ریکارڈر آن
ہو جاتا ——— سن رہے ہو ... آج دودھ والے نے جواب دے دیا ہے۔
چھوٹی بچی کی اُستانی نے ایک دوپٹے کی فرمائش کر دی ہے ——— اُسے پاس کرنے
کی فیس ——— ہنڈیا کا کنارہ ٹوٹ گیا ہے ——— نئی پانچ روپے میں آتی ہے۔
سن رہے ہو ———

— — — —

بندے نے سامنے دیکھا ———
وہی اُجاڑ اور خالی میدان ——— ایک ٹُنڈا سفید دیوار کہاں گئی؟
کہیں وہ ایک واہمہ تو نہیں تھی؟
ہاں واہمہ ہی تھی۔
وہ دیوار تو اُس جہان میں ہے۔
اَب کسی اور بندے کے سامنے۔
اُس جیسے کسی اور بندے کے سامنے۔
یا شاید ———
اُس جہان کے تمام بندوں کے سامنے۔

٩

"میری گردن کب لہو سے چپڑی جائے گی؟"
"اب زیادہ دیر نہیں"

۱۰

بندہ اگر اپنے ماحول میں مِس فِٹ ہوجائے (ایسے معاشرے میں جہاں جونکوں اور گدھوں کی حکمرانی ہو وہاں تمام سوچنے سمجھنے والے مِس فٹ ہوتے ہیں) تو وہ دکھی ہوکر اپنے گھر جاتا ہے اور سب سے لاتعلق ہوجاتا ہے اور اگر اپنا گھر کانٹوں بھرے کیکر کی طرح راستہ روک لے، سامنے سفید دیوار آجائے تو پھر بندہ دوستی کے گھنے درختوں کی چھاؤں تلے جا کھڑا ہوتا ہے۔ (سانس لینے کے لئے) اور اگر یہ چھاؤں بھی چھدری ہونے لگے .... (اِس معاشرے کی کمینی کامیابیاں دوستی کی خالص شراب میں پانی کی طرح گھلتی ہیں اور اس کا نشہ ختم کر ڈالتی ہیں ... ہاں اگر دوستوں کے درمیان کامیابی اور دولت میں بھی برابری کی سطح قائم رہے تب دوستی قائم رہتی ہے ورنہ نہیں ——) تو دوستی کے گھنے درخت ٹُنڈ بن جاتے ہیں —— روٹھے ہوئے یاروں کو بھلا کون مناتا ہے؟ اگر درخت پر پتّے نہ ہوں تو پھر چھاؤں کیسی .... اس کے بعد تم وہیں کھڑے رہو یا چٹیل میدان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر سدا کے لئے دھوپ میں جلنا ہی مقدر ٹھہرا تو بندہ اُجاڑ میدانوں کی جانب ہی

کیوں نہ چل دے؟ —— میدان والا ٹُنڈ مُنڈ درخت بہت بہتر ہوتا ہے کیونکہ وہ تو چھاؤں دینے کا دعوےٰ ہی نہیں کرتا۔

لوگوں نے کہا، وہ بُزدل ہے، سمجھوتا کیوں نہیں کر لیتا؟ —— معاشرے کے بدبودار جوہڑ میں مزے سے کھڑا رہے —— گھر والی کے سامنے اپنے جسم کو پتھر بنا لے، پتھر کا دماغ اور پتھر کی شریانیں —— دوستوں کے رُتبے کی قدر کرے اپنی اوقات میں رہے —— یہ سب کچھ کرنا تو بہت آسان ہے، کیوں نہیں کرتا؟ فرار کیوں ہوتا ہے؟ —— لیکن آپ ہی انصاف کیجئے کہ اگر وہ واقعی بزدل ہوتا تو خوفزدہ ہوکر سمجھوتا نہ کر لیتا؟ —— زورآوروں کے احکام کی گٹھڑی پیٹھ پر اُٹھائے حیاتی کے کھیت میں ایک پھرتیلے بیل کی طرح نہ بھاگتا؟ —— بے شک گدھ اُس کے جسم پر سوار ہوجاتے۔

اُس کے ماس میں چونچیں ڈبو کر اُس کا خون پیتے رہتے، اپنی گردنوں کو جی بھر کر سُرخ کرتے —— کیونکہ راج گدھوں کا تھا —— لیکن اُس نے انکار کر دیا اس اکلوتے انکار کے بعد اُس کے چاروں طرف چونچوں کی دیواریں کھڑی ہوگئیں۔ آہستہ آہستہ یہ دیواریں اس کے قریب آنے لگیں۔ اور پھر چونچوں کی یہ کال کوٹھڑی اتنی تنگ ہوگئی کہ سانس لینا بھی مشکل ہوگیا —— اگر وہ کچھ دیر اور اسی جہان میں رہتا تو گدھوں نے اُس کی آنکھوں کے ڈھیلے نکال کھانے تھے، کانوں کے پردے چھید دینے تھے اور زبان کو جڑ سے اکھاڑ لینا تھا —— اُس نے اپنے اندر کے کاٹھ کباڑ کو سچ کے جھاڑو سے سمیٹا اور باہر پھینک دیا اور یوں اندر صرف انتظار کا ایک تِنکا باقی رہ گیا —— تب وہ اِس میدان میں آکھڑا ہوا۔

اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھا —— تین طرف اُجاڑ کے اُجڑے ہوئے پکھیرو خوابیدہ تھے اور چوتھی جانب اُس کا اکلوتا ساتھی .... ٹُنڈ ... ننگ

پنگا، پتوں اور ٹہنیوں کے لباس سے عاری ـــــ شام ہوئی تو اس میدان کی حیاتی میں پہلی مرتبہ ـــــ پہلی مرتبہ بندے کی روح کی گردن کے ساتھ تنہائی کا تیندوا چمٹ گیا ـــــ آج کی رات کیسے گزرے گی؟

سورج غروب ہوا تو اُس کے چار چفیرے کا میدان یوں پیلا پڑ گیا جیسے کسی قبر کے اُوپر گیندے کے پھولوں کی چادر بچھی ہوتی ہے۔ سردی کے برف ہاتھ عرشوں سے اُتر کر میدان میں جذب ہونے لگے۔ بندے کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے اور وہ یوں بے اختیار ہو کر ٹھٹھرنے لگا جیسے بیری کا درخت بچوں کے ایک مرتبہ ہی جھلانے سے بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اُس کے اندر جو سائیں کا مَچ روشن تھا وہ بھی بے اختیار تھا اور اُس نے صدا دی "میں تمہارے اندر کو تو گرمائی دے سکتا ہوں لیکن باہر کے تم خود ذمّہ دار ہو ـــــ اپنی کوشش کر دیکھو ـــــ"

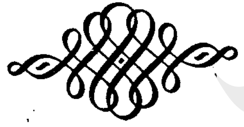
آج ـــــ پہلی مرتبہ
اُسے تنہائی کی زبانوں نے چاٹا۔
جسم کے اندر تنہائی کے کانٹے تیکھے ہو گئے۔
یہ خون چوسنے والی جونکوں کی
نامعلوم جلن نہیں تھی جو جسم کو چھلنی کرتی رہتی ہے۔
یہ تنہائی کا درد تھا۔

ـــ ـــ ـــ ـــ

"مجھے ایک ساتھی درکار ہے۔
میں اجتماعی جانور ہوں۔
میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔
میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

میرا جبڑا اتنی صدیوں سے مقفل ہے کہ
اب اُس میں کائی اُگ آئی ہے
میری زبان تالو کے اُوپر
ایک بوڑھے کچھوے کی طرح بیٹھی بیٹھی
اب اُکتا چکی ہے۔
یہ حرکت کرنا چاہتی ہے۔
اور میں نے . . . گفتگو کیا کرنی ہے؟
اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔
بس مجھے ایک ساتھی درکار ہے۔
کمیونی کیشن میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔

سیاہ موت رات نے باہیں پھیلائیں اور اُجاڑ میدان، بندے اور ٹُنڈ کو آغوش میں لے کر تاریکی کے گہرے سمندروں میں غوطہ مار گئی۔



١١

ایک بادل ـ ـ ـ ـ
سیاہ رنگ کا ــــ گرجتا ہوا بادل۔
گِدھوں کا ایک بادل،
شمال کی جانب سے شوکتا ہوا آیا۔
بے شمار پَروں کی شوکتی ہوئی آواز
بگولے کے پھیلے اور طویل سانس کی طرح
آہستہ سے کانوں میں آئی۔
اور پھر۔۔۔۔ نزدیک ہونے لگی۔
بندے نے اپنے اُوپر ایستادہ
آسمان پر نگاہ ڈالی
یہ تو صرف دو تھے ۔۔۔۔ ایک گدھا، گدھا!
آج یہ ریوڑ کا ریوڑ کہاں سے نمودار ہو گیا۔

اس کا ہاتھ اپنی پیٹھ کی جانب لپکا۔۔۔۔
نہیں ــــ میں اُنہیں اپنی پیٹھ کے اندر
چونچیں نہیں گھسیڑنے دوں گا۔
میں تو اُس جہان کو چھوڑ آیا ہوں
جہاں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔
میں اچھے جولاہے کا گدھا تو نہیں ــــ ایک گدھا!
گِدھوں کی شوکتی ہوئی آواز نزدیک آنے لگی۔۔۔۔
اور نزدیک ۔۔۔۔
اس کے پاس کلّر زدہ زمین کے ایک ٹکڑے نے ــــ
اپنے اُوپر بچھی دھوپ کو چوس لیا تھا ــــ
تاریکی کا دروازہ کھول دیا تھا
سایہ! موت کا سایہ۔۔۔۔
گدھوں کے سیاہ بادل کا سایہ، اُس کے پاس کلّر زدہ زمین
کے ایک ٹکڑے پر۔۔۔۔ موت کا سایہ!
بندے کے دل میں چھُپے خوف کے سنپولئے نے ــــ
اپنی دُم ہلائی۔
"ہاں میرا وجود ہے ۔۔۔۔ میں خوف ہوں"
زمین کا وہ ٹکڑا جو روشنی سے الگ ہو کر
اندھیرے کی جانب رواں تھا۔۔۔۔ پھیلنے لگا،
پھیلتا گیا۔
گِدھ نیچے ہوتے گئے۔

زمین پر اُن کا سایہ ، سیاہی چوس پر گرتے
روشنائی کے قطرے کی طرح پھیلتا گیا۔
بگولے کے طویل سانس اب
ساون کے بادلوں کی طرح گرجنے لگے۔
لاکھوں پھَن والے سانپوں کی شُوک۔

سایہ !
گِدھوں کا سایہ،
پانی میں گرتے نیل کی طرح
پھیلتا گیا۔
بندہ پھیلتے ہوئے سائے کو مبہوت ہو کر
اس طرح دیکھ رہا تھا —— جیسے
کسی نے اُس پر ٹونا کر دیا ہو —— جادو کر دیا ہو
مبہوت اور بے اختیار ہو کر وہ دیکھتا رہا۔
سائے کو ! سائے کو !
بھلا وہ اپنے اُوپر گرجتی موت کو دیکھنے کا
حوصلہ کہاں سے لاتا ؟
بس وہ گم سُم ہو کر ——
پھیلتے ہوئے سائے کی طرف دیکھتا رہا . . . .
جو چڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح
اُس کے پاؤں کے قریب پہنچ رہا تھا
سایہ جتنا نزدیک ہو رہا تھا . . . گِدھوں اور اُس کے درمیان

فاصلہ . . . . اُسی حساب سے کم ہو رہا تھا۔
بالآخر سایہ اس کے پاؤں تک آ گیا۔
بوٹوں پر پڑا۔
گھٹنوں تک آیا . . . .
کولہوں تک پہنچا۔
سینے پر چڑھ بیٹھا۔
کندھوں پر سوار ہو گیا
اور پھر . . . اس کے سارے وجود پر
پرچھائیں پھیل گئی . . . . سایہ ہو گیا۔
سائے کا سیلاب اُسے ڈبو چکا تھا۔
اُس کی آنکھیں ایک پُتلی کی طرح اچانک کُھلیں
کُھلیں اور بند ہو گئیں اور پھر کُھل گئیں "جاگو
اگر تم مزید ایک پل کے لئے بھی یوں
ساکت کھڑے رہے تو
تمہارے جسم پر گِدھوں کا سایہ نہیں
اُن کی چونچیں ہوں گی . . . . جاگو"
اُس نے دل کڑا کر کے آسمان کی طرف دیکھا
(آسمان تو دکھائی نہ دیا کہ درمیان میں
گِدھوں کی پرواز کرتی ہوئی دیوار تھی)
اس کی نظروں کے سامنے . . . .

بے انت گدھوں کے پَر پھیل گئے
پتہ نہیں وہ بے انت تھے یا . . . . .
صرف ایک ہی گدھ تھا جس کے پَر
آدھے آسمان پر محیط تھے۔
نہیں . . . . صرف ایک گِدھ نہیں تھا۔
بے اَنت تھے۔
پَروں سے بنی ہوئی ایک دیوار تھی۔
دیوار نہیں چار دیواری تھی۔
اور لمبی گردنوں کا احاطہ تھا۔
اور اِس چار دیواری اور اس احاطے کے درمیان میں
درمیان میں . . . .
ایک ننھا سا گیند . . . لڑھک رہا تھا۔
پنگ پانگ کے سفید گیند جتنا . . . .
جیسے تاریک سمندروں پر . . . ایک سفید بگلا۔
اُس کے سفید جسم پر . . . .
خون کے سُرخ چھینٹے۔
ایک چونچ . . . . اُس کے کومل جسم میں کھُبتی . . . .
اور وُہ . . . . برچھی میں پروئے کسی بندے کی طرح
تڑپ کر اپنے آپ کو علیحدہ کرتا . . . .
رُخ بدل کر دوسری جانب پرواز کرنے لگتا تو . . . .
چونچ کی ایک اور برچھی منتظر ہوتی، اُس میں

پرو دیا جاتا۔
ساری چونچوں پر خون کی سُرخی تھی
لیکن گدھ . . . .
صرف چونچ رنگ لینے پر اکتفا نہیں کرتے
چونچ کے پیچھے گردن بھی تو ہوتی ہے ـــــ اور جب تک
گردن نہ رنگی جائے ـــــ لُطف نہیں آتا۔
"کبھی تم نے بندا کھایا ہے؟"
"کوئی ایک مرتبہ . . . ."
"گیند کی طرف دھیان کر ـــــ بندا کھانے کا وقت ابھی نہیں آیا"
شاید حیات کا یہی کھیل ہے (بندے نے سوچا)
لیکن یہ کھیل نہیں ہو سکتا
اَن گنت چونچوں اور ایک گیند کے درمیان . . . .
کھیل کبھی نہیں ہو سکتا
ہاں، حیات و موت کی کشمکش ضرور ہو سکتی ہے۔
پروں کا گیند . . . .
چونچوں کے گھیرے میں . . . .
یوں مَسلا گیا . . . . جیسے
کھردرا ہاتھ . . . .
کومل چھاتیوں کو . . . .
مَسل دیتا ہے۔
پروں کا گیند . . . .

چار چھیرے ایستادہ، موت کی دیوار سے
سر ٹکراتا ہے .... باہر نکلنے کا چارہ کرتا ہے۔
مگر ہر بار ایک اور چونچ گیلی ہو جاتی ہے .... سُرخ ہو جاتی ہے۔
آخری گھڑی نزدیک آ پہنچی ....
سیاہ بادل بندے کے سر پہ گرجنے لگا۔
پروں کا گیند ادھ موا ہو گیا ....
مزید ایک چونچ .... اور
اُس کی اُڑان ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی۔
"مجھے ایک ساتھی درکار ہے"
بندے نے گردن اُٹھائی
لاکھوں برس پہلے کی گمشدہ وحشی قوت کو
صدا دی۔
اس قوت کو اپنے ٹخنوں میں سے کھینچ کر
سینے تک لے آیا۔
اِس قہر کو دل میں جلتے الاؤ میں سے گزار کر
آنکھوں میں اُنڈیلا۔
اور پھر ....
جلتی ہوئی یہ دو آنکھیں .... گدھوں کی دیوار پر ....
رکھ دیں۔
جیسے بھُس میں دو چنگاریاں گریں ....
ایسے موت کی دیوار میں دو سوراخ ہو گئے۔

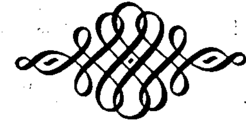
دو زخم کھُل گئے۔
پروں کے گیند نے گھُپ اندھیرے میں دو لکیریں ....
چمکتی ہوئی دیکھیں ....
لکیروں میں سے روشنی، پنجوں کے بل چلتے چور کی مانند
دھیرے دھیرے اندر آ رہی تھی .... (حیات کا سندیسہ)
وہ ایک ہی اُڑان میں روشنی کے اِن سوراخوں میں سے
گذرا اور ....
باہر آ گیا۔
ایک گہرا سانس۔
آزادی کا سانس۔
روشنی کا سانس۔
بندے نے اپنا ہاتھ اُونچا کیا .... اور ہتھیلی کھول دی،
پروں کا گیند نیچے آیا،
پُروا کے ایک جھونکے کی طرح۔
چُپ چاپ، ہتھیلی پر بیٹھ گیا،
وہ ایک تنکے سے بھی ہلکا تھا ....
یہ پکھیرو تھا۔
بندے کی آنکھوں میں سے اُبلتے قہر کی تپش نے گدھوں کے جسم اس طرح
جلائے کہ اُن کا سیاہ بادل بے اختیار ہو کر آسمانوں کو پرواز کر گیا۔ بے اختیار جیسے
کسی بگولے کی زد میں آ گیا ہو۔
بندے کی ہتھیلی کو پکھیرو کے نرم نرم پنجے ایسے محسوس ہوئے جیسے باپ

کی چوڑی چھاتی پر سویا بچّہ اپنی انگلیاں اُس کے سخت جسم پر پھیلا دیتا ہے۔

"کیوں بھئی کیا اچھے جولاہے کے گدھے اُس جہان میں ختم ہو گئے ہیں
جو اَب تم ایسے مسکینوں کے درپے ہو گئے ہیں؟"

بندے کی ہتھیلی پر پکھیرو کے پنجوں کا ہلکا سا بوجھ محسوس ہوا اور وہ اُڑا.... اور ٹُنڈ پر جا بیٹھا.... ٹنڈ کی سوکھی ٹہنیوں پر اُس کے گیلے خون کے چند قطرے گرے۔ اُس کے تمام پَر علیحدہ علیحدہ ہو چکے تھے.... بکھرے ہوئے تھے.... ایک پَر اُس کے نرول جُثّے سے الگ ہوا اور جھولتا ہوا زمین پر اُترنے لگا.... بندے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا.... زمین پر گرنے سے پیشتر ہی اُسے پکڑا اور اپنے کوٹ کے کالر میں سجا لیا....

یوں اکلاپے کے شیشے میں دراڑ آئی۔
بندے اور پکھیرو کی سانجھ کی بنیاد رکھی گئی۔



(١٢)

"نیچے دیکھ"

"کچھ بھی نہیں.... وہی اجاڑ میدان، وہی بندا اور وہی ٹُنڈ....
لیکن اَب ٹُنڈ کے اُوپر وہی پکھیرو بیٹھا ہوا ہے"

"وہی پکھیرو؟.... ایک نوالا بھی نہیں ہو گا.... تم بندے کی طرف دھیان
کرو"

۱۳

اُجاڑ میدان .... ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کہیں .... وجود کے اندر .... اندر کے اندر .... آسمانوں سے باتیں کرتی ایک ایسی پتنگ جس کی ڈور کا سرا نامعلوم .... اور اس میدان میں نہ بندا نہ پرندہ .... نہیں بندا بھی اور پرندہ بھی —— اور ٹنڈ بھی۔

نہ تو بندے نے زبان ہلائی اور نہ ہی پکھیرو نے چونچ کھولی .... بندا اس لئے خاموش رہا کہ وہ ابھی اپنی حیاتی کے پہلے ساتھی کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا.... (جس روز وہ اس میدان میں آیا اُسی روز تو اس کی اصلی حیاتی کا آغاز ہوا تھا .... وہ یہاں بالکل پاک ہو کر آیا تھا .... پیدا ہونے کے بعد پہلے سانس کی طرح) وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے والا پہلا ذی رُوح تھا .... اور پکھیرو؟ .... اُس میں تو سکت ہی نہیں تھی بولنے کی .... اُس کا جسم تو ایک روئی دار گدّے کی طرح سِلا ہوا تھا .... چونچوں کی سوئیوں سے .... اُس کے پَر بکھرے ہوئے تھے اور زبان چِھد چکی تھی .... بندا، پکھیرو کی جانب دیکھتا اور مسرّت اُس کے جسم میں

بھر جاتی .... اور پکھیرو وہ دیکھنے کا چارا کرتا .... مگر وہ تو بول ہی نہیں سکتا تھا۔

یوں بے حساب دن اور رات بیت گئے۔

آہستہ آہستہ پکھیرو کے بکھرے ہوئے پَر جڑنے لگے .... ٹوٹے ہوئے پروں کی جگہ نئی کونپلیں پھوٹیں .... اُس کے زخم بھرنے لگے .... چھدی ہوئی زبان پر نیا ماس اُگنے لگا .... ٹنڈ پر گرے ہوئے خون کے قطرے خشک ہوتے گئے .... پہلے تانبے کے رنگ کے ہوئے پھر سیاہ اور بالآخر دھوپوں نے انہیں چاٹ لیا .... ایک صبح آئی .... اور پکھیرو نے اپنی چونچ کھولی۔

پکھیرو : میں پکھیرو ہوں۔

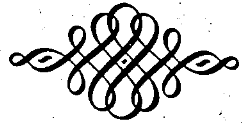
بندا : میں بندا ہوں۔

پکھیرو : تم اِس اُجاڑ میدان میں کیا کرنے آئے ہو؟

بندا : پہلے تم بتاؤ .... تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟

پکھیرو : تم نے دیکھا تو تھا .... گِدھوں نے میرا محاصرہ کر کے مجھے یہاں لا پھینکا تھا۔

بندا : مجھے بھی گِدھوں نے .... (اس پکھیرو کو میں دیکھ چکا ہوں .... لیکن کہاں؟ کب؟ .... اس جہان میں .... میں اسے جانتا ہوں، اسے نہیں تو اِس کی پروں کی ٹھوکر کو جانتا ہوں .... پر کیسے؟ .... کہاں؟)

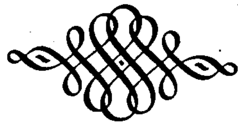


(۱۴)

کہیں پچھلی حیاتی میں ایک بنگلہ تھا ... لان کی خشک گھاس کے درمیان ایک درخت ... سبز پتوں اور زندہ ٹہنیوں والا درخت ... یہ بنگلا ایک ایسے دوست کا تھا جسے ابھی اپنے اور بندے کے درمیان دَھن کی کھائی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ دولت کا زہرا بھی سطح پر تھا، آنتوں اور رگوں میں نہیں اُترا تھا ... وہاں اُس بنگلے میں دوستوں کی بیٹھک ہوتی، انگوروں کا تیز رس زبانوں، مسوڑھوں کو سینکتا جب جسموں میں اُترتا تو ایک عارضی علیحدگی، گدھوں سے، جونکوں سے، سفید دیلواروں سے وجود میں آتی اور جب سب لوگ باہر سے کٹ کر اپنے اندر میں جھانکنے لگتے تو وہ چپکے سے دروازہ کھول کر باہر لان میں آجاتا ... لان میں سبز پتوں اور زندہ ٹہنیوں والا درخت تھا ... بندے کے پیلے ہاتھ اُس کے تنے کو آغوش میں لیتے اور وہ اس کے ساتھ کان لگا کر اُس کے سبز سانس سننے لگتا ... یہ درخت بھی زندہ ہے، میری طرح ... لیکن میں پتوں اور ٹہنیوں کے بغیر کیوں ہوں ؟ پہلے پہل تو وہ درخت کے ساتھ اِس لئے لپٹتا کہ اُسے اُس میں سے محبت کی مہک اور زندگی کی باس آتی تھی (کیونکہ وہ اِن خوشبوؤں کے لئے ترستا تھا) اور پھر ایک شب جب چاندنی کا سفید غبار کل کائنات پر معلق تھا جیسے روئی دھننے والے کی کوٹھڑی سفید دودھ ہوئی ہوتی ہے، اُس نے درخت کو اتنی شدت کے ساتھ گلے لگایا (اس روز وہ گِدھوں اور سفید دیلوار سے کچھ زیادہ ہی اُکتا گیا تھا) اتنی قوت سے جھنجھوڑا (جیسے بیروں سے لدی بیری کو جھنجھوڑتے ہیں ... جو بن اِک بیری) کہ پہلے تو اُس پر خزاں رسیدہ پتے سُرخ برف کی مانند گرنے لگے، پھر کورے کاغذ کی ایک کھڑکھڑاہٹ ... درخت کے پتوں میں خوابیدہ ایک پکھیرو اُڑ گیا ... درخت کی زندگی جیسے نچڑ گئی ہو ... دوسری شب وہ پھر درخت کے پاس جا کھڑا ہوا ... اس پکھیرو کو کیا حق ہے کہ وہ یوں سکھ چین سے سوتا ہے (اگر مجھے یہ حق حاصل نہیں) اُس نے تنے کو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اور پکھیرو پَر پھیلاتا نظروں سے اوجھل ہو گیا ... اب وہ ہر شب اسی طرح کرتا ... اور پھر ایک شب ایسی آئی کہ اُس نے درخت کو جھنجھوڑا مگر کچھ بھی نہ ہوا ... نہ پتے گرے ... اور نہ ہی پَروں کی سرسراہٹ کانوں میں اُتری ... پکھیرو وہ درخت چھوڑ چکا تھا ...

پکھیرو : (دل ہی دل میں) وہ پکھیرو میں تھا۔

بندا : (دل ہی دل میں) ہاں مجھے معلوم ہے۔



۱۵

”اب تو وہ دو ہو گئے ہیں .... وقت کب آئے گا؟ .... کب؟“
”حوصلہ رکھو .... جتنا انتظار کرو گے اتنا ہی تمہاری گردن پر خون کا لیپ گاڑھا ہو گا .... ابھی وقت نہیں آیا۔“

۱۶

گِدھوں کی پرچھائیں بندے کے اُوپر بچھی اور آنکھ جھپکتے میں دور ہو گئی۔ اس نے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا .... دو گِدھ .... مگر اِتنی بلندی پر کہ اُن کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا ...

پکھیرو : کیا دیکھ رہے ہو؟

بندا : گِدھ ....

پکھیرو : ابھی دُور ہیں .... لیکن بالآخر یہ نزدیک ہوں گے .... تم اُن کے آنے سے پیشتر میرے ساتھ جی بھر کے باتیں کر لو۔

بندا : (دل ہی دل میں) یہی تو میں چاہتا ہوں۔

پکھیرو : تم مجھے یہ بتاؤ .... اس اُجاڑ میدان میں کیا ڈھونڈنے آئے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ .... تمہیں کس کی تلاش ہے؟ .... اُس جہان میں کامیابی کا نسخہ تلاش کرنے کے لئے یہاں آ گئے ہو .... یا اتنے ڈرپوک ہو کہ وہاں کی کٹھنائیوں سے دامن چھڑا کر یہاں بھاگ آئے ہو؟

بندا : (یہ پکھیرو .... اس ویرانے میں میرا پہلا ساتھی، یہ بھی مجھے فراریت پسندی کا الزام دیتا ہے .... شاید اس لئے کہ میں نے اِسے درخت میں سے اُڑا دیا تھا) کامیابی کا نسخہ حاصل کرنا تو چنداں دشوار نہیں .... خون کو سفید کر لو، بس یہی نسخہ ہے .... اور میں ڈرپوک بھی نہیں، میں نے پورے چالیس برس اُس جہان میں گزارے ہیں۔

پکھیرو : تو پھر یہاں کیسے آ گئے؟ .... کیسے پہنچ گئے؟

بندا : بس یوں سمجھ لو کہ ایک شام میں گھر واپس آیا (پندرہ جنازے دیکھنے کے بعد) ہمیشہ کی طرح گھر والی کے ماتھے پر شکنوں کا ایک جال تنا ہوا تھا (کچھ میرا بھی خیال کرو .... کوئی تو خیال کرے .... میں سانس لیتا ہوں .... اگر سانس لیتا ہوں .... اگر سانس لیتا ہوں تو زندہ بھی ہوں اور زندہ بندے کو پیار کی ضرورت ہوتی ہے .... مجھے دھتکارو نہیں) مگر اُس بھاگوان کے چہرے پر میرے لئے سدا کی بیزاری اور ناپسندیدگی کی شکنوں کا سیلاب آیا ہوا تھا .... کب تک؟ .... کب تک؟ گدھوں کی چونچیں مجھے دھکیلتے ہوئے گھر پہنچا دیتی تھیں مگر وہاں بھی .... ایک اور گدھ .... میں چارپائی پر لیٹ گیا اور اپنی سفید دیوار کو دیکھنے لگا .... سفید دیوار جو میری سدا کی سجنی تھی۔ میری گھر والی کی آواز اس شام اتنی تیز اور نوکیلی تھی کہ میرے کانوں کے پردوں میں چھید ہو گئے .... اُن سے خون کی ندیاں بہہ نکلیں .... آنکھیں سُوج کر سُرخ بیروں کی طرح ہو گئیں .... میرا دماغ غبارے کی طرح پھولنے لگا .... میں سفید دیوار کو دیکھتا رہا .... دیکھتا رہا .... اور پھر یوں ہوا کہ گھر والی کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی .... پیچھے رہ گئی .... کُل جہان پیچھے رہ گیا .... میں سفید دیوار کی طرف دیکھتا رہا اور ہر شے سے الگ ہو گیا .... سب کچھ پیچھے رہ گیا .... اُس جہان کا سمندری جہاز ڈوب گیا اور ہر طرف خاموشی چھا گئی .... خاموشی .... ویرانی .... اکلاپا .... میں وہاں سے بھاگ آیا ہوں یا مجھے بھگا دیا گیا ہے .... مجھے کچھ پتہ نہیں .... بس ایک پل تو میں چارپائی پر لیٹا سفید دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا اور دوسرے پل .... میں یہاں تھا .... اِس اُجاڑ میدان میں تن تنہا سفید دیوار اور اُجاڑ میدان کے درمیان سفر میری ہوش سے باہر ہے .... مگر یہ بتاؤ کہ میں تو یہاں آ کھڑا ہوا ہے یا مجھے یہاں دھکیل دیا گیا .... تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟

پکھیرو : تم نے سب کچھ دیکھا، پھر بھی پوچھتے ہو؟ گدھ میرے وَیری تھے ....

بندا : لیکن گدھ سبھی کے وَیری تو نہیں ہوتے .... اِس جہان میں (یا شاید اُس جہان میں) لاکھوں پکھیرو ہوں گے جن کے وہ وَیری نہیں ہیں .... وہ تمہارے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے!

پکھیرو : (ہنس کر) میرے پیچھے وہ اس لئے پڑ گئے کہ میں اپنی ڈار سے الگ ہوں ....

بندا : (میں بھی الگ ہوں) لیکن تمہیں کس نے الگ کیا؟

پکھیرو : میں نے .... اپنے آپ کو .... خود الگ کیا۔

بندا : لیکن کس طرح؟

پکھیرو : ایک مرتبہ اس جہان کے کُل پکھیروؤں کا اجتماع ہوا .... وہ بھی آئے جن کے نام تھے اور وہ بھی پہنچے جن کا کوئی نام نہ تھا .... (فریدالدین عطار کی کتاب "منطق الطائر" میں بھی اس کا ذکر ہے لیکن کسی اور

رنگ میں) وہاں ہُدہُد آیا جسے فخر تھا کہ اُس نے رب کے سچے نبی سلیمانؑ کو ملک حبشہ کا راستہ دکھایا تھا.... گلہری بھی آئی جو اِس بات پر نازاں تھی کہ وہ حضرتِ موسیٰؑ کی قربت میں رہی ہے.... طوطا بھی پہنچ گیا ...."میں خضر کی طرح سبز پوش ہوں"۔ اُس نے سینہ پھلا کر اعلان کیا.... بُلبل اپنے آپ کو لحنِ داؤد کی وارث کہتی تھی.... فاختہ کو بھی فخر تھا کہ طوفانِ نوح کے بعد اُس کی چونچ میں شاخِ زیتون دیکھ کر ہی نوح کو اندازہ ہوا تھا کہ پانیوں کے درمیان کہیں خشکی کا ایک ٹکڑا اُبھرا ہے ....مور نے اپنے پَروں کا رنگین پنکھا کھولا کیونکہ وہ اپنے آپ کو پکھیروؤں کا جبریل کہتا تھا....

بندا : اور تمہیں .... تمہیں اپنی کس خصوصیت پر فخر تھا؟

پکھیرو : بس یہی تو فرق تھا مجھ میں اور اُن میں .... میری کوئی خصوصیت نہ تھی، مجھے کسی بات پر فخر نہ تھا.... میں صرف ایک پکھیرو تھا۔

بندا : (دل ہی دل میں) یہی تو قابلِ فخر بات ہے پگلے.... مجھے بھی صرف ایک بندا ہونے پر فخر ہے۔

پکھیرو : ہُدہُد کہنے لگا "کُل جہان کے جانوروں کے اپنے اپنے سردار ہوتے ہیں۔ بڑے ہوتے ہیں.... لیکن ہمارا کوئی سردار نہیں، آؤ ہم سب اُس کا کھوج لگائیں.... پسح کو تلاش کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ پسح (ہمارا سردار ہمارا بڑا) "قاف" کے پہاڑوں کے پیچھے رہتا ہے .... اور اُس پسح کا نام سِی مُرغ ہے۔

بندا : (دل ہی دل میں) میرے ایک دوست نے تہران کی پہاڑی دماوند دیکھی تھی جہاں ایک روایت کے مطابق سِی مُرغ کا بسیرا ہے.... لیکن وہ قاف کی پہاڑی تو نہیں....

پکھیرو : لیکن سِی مرغ تک پہنچنے کے لئے راستے دشوار تھے اور ہم میں سے کسی کو بھی مرنے کا شوق نہیں تھا.... سب پکھیرو بہانے بنانے لگے۔ کسی نے کہا "ہمیں پسح کی کیا ضرورت ہے؟.... مجھے اچھا کھانے کو ملتا ہے، اچھا پہننے کو ملتا ہے.... میں نے پسح کو کرنا کیا ہے؟" کسی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا "اُن راستوں پر موت ہماری منتظر ہوئی تو؟" ایک نے سوال کیا "اگر عہدِ قدیم سے ہمارے بزرگ پسح کے بغیر رہتے آئے ہیں تو آخر ہمیں آج اس کی ضرورت کیوں ہے؟" تمام پکھیروؤں نے اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق سوال کئے لیکن ہُدہُد نے ان تمام سوالوں کے ایسے ٹھوس جواب دیئے کہ سب خاموش ہو گئے اور اُس کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئے.... میں بھی اُن کے ساتھ پرواز کرنے لگا۔

بندا : (دل ہی دل میں) بندوں سے پکھیرو بہتر ہیں جو کم از کم پسح کو تلاش کرنے کی جستجو تو کرتے ہیں۔

پکھیرو : سِی مُرغ کو تلاش کرنے کے لئے ہمارا سفر شروع ہو گیا.... ہم تلاش، پیار۔ یقین۔ آزادی۔ وصال۔ حیرانی اور غربت، موت اور نہ ہونے کی سات وادیوں میں سے گزرے۔ اِس سفر کے دوران کئی پکھیرو سمندروں میں ڈوب گئے۔ کچھ ایسے تھے جن کی زبانیں سوکھ گئیں اور وہ برف کی وادیوں میں پیاسے مر گئے۔ کئیوں کے جگر سورج کی تپش سے راکھ ہوئے اور اُن کے پَر جھڑ گئے۔ کچھ جنگلوں اور صحراؤں میں گُم ہو گئے۔ کئی اپنے حواس کھو بیٹھے اور پاگل پن میں ایک دوسرے کو کھا گئے اور کچھ نے ایسی انہونی شکلیں دیکھ لیں کہ وہ حیرت سے ہی

مر گئے .... اور بالآخر سینکڑوں برسوں کی مسافت کے بعد جب ہم "قاف" کی پہاڑیوں کے قریب پہنچے تو لاکھوں پکھیروؤں میں سے صرف تیس باقی بچے تھے .... ہمارے سامنے ایک پردہ تھا .... ہُدہُد کہنے لگا، اِس پردے کے پیچھے سی مرغ ہے .... سچ ہے .... پردہ اُٹھا تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے .... شائد ایک آئینہ تھا.... کیونکہ سامنے ہماری شکل کے .... بالکل ہماری شباہت کے ..... تیس پکھیرو تھے .... جیسے ہماری تصویر بنا کر ہمارے سامنے رکھ دی گئی ہو .... آئینے میں ہم خود تھے .... ہماری اپنی پرچھائیں تھی۔ کیونکہ ہم خود سچ ہیں .... سب کچھ ہم آپ ہیں .... ہم ہی مرغ تھے۔

بندا : سب کچھ ہم آپ ہیں؟ .... یعنی میں بھی خود ہی سب کچھ ہوں؟ .... لیکن تم اُن سب سے الگ کیسے ہو گئے؟

پکھیرو : سب پکھیروؤں نے سوال کئے .... اپنے آپ سے۔

بندا : تم نے کونسا سوال کیا؟

پکھیرو : میں نے پیٹ کی بات کی .... میں نے پوچھا (اپنے آپ سے کیونکہ میں خود سچ تھا) سچ کی بجھارت اگر بُوجھ بھی لی جائے، سی مرغ کی پہچان ہو بھی جائے تو بھی ایک بنیادی سوال کا فیصلہ نہیں ہو پاتا .... سچ کے ساتھ ساتھ دانے پانی کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔

بندا : پھر؟

پکھیرو : پھر میں نکالا گیا۔

بندا : (میری طرح) ڈار سے الگ ہونے کا یہی انجام ہوتا ہے۔

(١٧)

پکھیرو : تُونے تو اِس جہان کے اندر رہ کر اِس کا نظارہ کیا ہے لیکن میں نے تو اس سے الگ ہو کر .... درمیان میں مسافتوں کی طوالت ڈال کر نیچے جھانکا ہے۔ میں نے جب بھی آسمانوں سے نیچے جہان پر نگاہ کی تو مجھے مخلوق سے پُر شہر اس طرح دکھائی دیتے جیسے چٹیل میدان ہوں .... صحرا ہوں .... ہر طرف بربادی دکھائی دی اور اِن بربادیوں میں آباد لوگ ریت میں سر چھپائے دکھائی دیئے .... تم بھی تو اُن کے بھائی بند ہو .... تم نے بھی حیات اسی طریقے سے گذاری؟ ریت میں سر چھپائے؟

بندا : نہیں .... اگر میں یہ کر لیتا تو الگ کیسے ہو جاتا .... میں نے ایسا نہیں کیا.... لیکن تم نے بات بہت کام کی پوچھی ہے .... تم نے سچ کہا ہے، میں بھی تنہا صرف اس لئے رہ گیا کہ میں نے اپنی گردن ریت سے باہر رکھی تھی، میں چاروں طرف بکھری ہوئی بربادیوں کا چشم دید گواہ

تھا.... لیکن میرے آس پاس (یا شاید مجھے ہی ایسا لگتا تھا یا ایسا تھا۔) بندوں کی گردنیں ریت میں تھیں شتر مُرغ کی طرح.... اُن کے جسموں میں سے لہو ٹپکتا تھا، وہ کھا کھا کے اُبھر گئے تھے.... میں تن تنہا اُن کے درمیان کھڑا تھا۔ گردن اُٹھائے.... دہائی دیتا ہوا کہ یوں ریت میں گردنیں دفن کر کے.... اپنی آنکھوں کانوں اور زبانوں پر ریت کی چادر لپیٹ کر زندگی بسر نہ کرو.... کچھ دیکھو.... کچھ سنو.... کچھ بولو.... تمہارے اِردگرد جو کچھ ہو رہا ہے اُس میں سے اپنا حصّہ وصول کرو.... یوں ریت میں منہ چھپا کے آسائش کی گرمی میں نہ اونگھو.... سرد موسموں کا مزا بھی چکھو.... جن پر ظلم ہو رہا ہے اُن کی فریاد سنو.... جو جیتے جاگتے ہی مرتے جاتے ہیں اُن کو دیکھو!.... اور پھر زبان کو حرکت دے کر احتجاج کرو.... کچھ تو بولو۔

پکھیرو : تمہیں کوئی جواب ملا؟

بندا : (ہنس کر) ہاں ملا.... انہوں نے آسائش کی گرمی کے کنوؤں میں سے گردنیں باہر نہ نکالیں اور وہیں سے بولے.... دور ہو جاؤ.... دفع ہو جاؤ.... دفع دور.... تم دیکھتے نہیں کہ ہم کتنے مزے میں ہیں۔ آس پاس دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں.... کوئی ضرورت نہیں.... اپنی اپنی گردنوں کو آسائش کی گرمی میں رکھنا ہی حیات کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

پکھیرو : پھر تم تنہا ہو گئے؟

بندا : ہاں.... پھر میں تنہا ہو گیا۔

۱۸

بندا : یہ بتاؤ.... دنیا جہان کے تمام دیس تمہارے پَروں کے نیچے سے گذرے ہوئے ہیں.... وہ دیس بھی ہمارے دیس کی طرح ہی ہیں؟

پکھیرو : میں تمام دیسوں میں تو نہیں گیا.... اپنا گھر بار چھوڑ کر میں صرف اُن دیسوں کو گیا جہاں میرے بدن کو حدّت ملتی تھی.... مجھے کھانے کو ملتا تھا.... جہاں میرا پیٹ خالی نہیں رہتا تھا۔

بندا : وہ کونسے مقام ہیں.... مجھے بھی تو بتاؤ؟

پکھیرو : اُدھر جہاں بندے کو بندا سمجھتے ہیں.... جہاں سب برابر ہیں۔

بندا : سُنا ہے وہاں ربّ رسول کا نام کوئی نہیں لیتا؟

پکھیرو : وہاں بندے کا نام لیتے ہیں۔

بندا : (اپنے آپ سے) وہاں میرا نام لیتے ہیں۔

پکھیرو : (اپنے آپ سے) ہاں وہاں تمہارا نام لیتے ہیں۔

بندا : (اپنے آپ سے) یہ پکھیرو کتنا خوش قسمت ہے جو وہاں سے ہو کے آیا ہے۔

پکھیرو : کیا بات ہے؟ تم خاموش کیوں ہو گئے ہو!

بندا : میں خاموش نہیں ہوں۔ صرف تمہیں میری آواز سنائی نہیں دی۔

پکھیرو : وہاں بندے کا نام لیتے ہیں .... وہاں پکھیرو کا نام لیتے ہیں۔

بندا : اگر وہ دیس اتنے اچھے ہیں تو تم ہمیشہ اپنی دھرتی کی جانب ہی کیوں لوٹ کر آجاتے ہو؟

پکھیرو : میں کھنچا چلا آتا ہوں، بے اختیار ہو کر۔

بندا : بھوک تمہیں اِدھر کھینچتی ہے؟

پکھیرو : نہیں یہ دھرتی مجھے کھینچتی ہے .... اُن دیسوں میں جاتا ہوں تو وہاں کے پکھیرو مجھے بہت خوبصورت اور رنگین دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے کسی رنگ ساز نے انہیں رنگوں سے لبریز کنستر میں ڈبو کر نکالا ہو .... اور میرا رنگ؟ .... ویسا ہی جیسی میری دھرتی ہے .... مٹی کا رنگ .... اُن دیسوں کے پکھیرو مجھے بدصورت کہتے ہیں .... میں واپس آتا ہوں اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہوتا ہوں تو یہاں سبھی پکھیرو میرے جیسے ہوتے ہیں .... اس لئے میں واپس آجاتا ہوں .... میں اُن دیسوں میں نہیں رہ سکتا جن کی زمین کا رنگ میرے پروں سے مختلف ہو چاہے وہ میرے دیس سے لاکھ بہتر ہوں، وہاں پیٹ بھر کھانے کو بھی ملتا ہو .... میں وہاں ہمیشہ کے لئے نہیں رہ سکتا .... یہاں سب پکھیرو میرے جیسے ہیں۔

بندا : سب پکھیرو؟

پکھیرو : سبھی تو نہیں .... کچھ بہت دھن والے ہیں (جن کے کملے بھی سیانے ہوتے ہیں) رنگ تو اُن کا بھی میرے جیسا ہے۔ اُن کے پَروں کی جڑیں بھی اِسی دھرتی کے رنگ کی ہیں لیکن انہوں نے بیرونی ملکوں سے

مختلف رنگ درآمد کر کے اپنے آپ کو اُن میں رنگ لیا ہے .... سُرخ سبز، زرد .... لیکن اندر سے سب مٹیالے ہیں۔

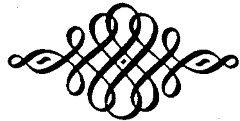
بندا : بندوں نے بھی یہی کسب کیا ہے۔

پکھیرو : (دل میں) مجھے معلوم ہے۔

بندا : (دل میں) مجھے بھی معلوم ہے کہ تمہیں معلوم ہے۔

اور یوں بندا اور پکھیرو ایک دوسرے کو اپنی آپ بیتی سناتے رہے۔ اُن کے آس پاس رُتوں کے میلے لگتے رہے .... وہ پوہ ماگھ کی برفیلی رُتوں میں ٹھٹھرتے، جیٹھ ہاڑ کی کڑکتی دھوپوں تلے جلتے، ساون بھادوں کی برساتوں میں بھیگتے ایک دوسرے کی تنہائی کی دیواروں کو مسمار کرتے رہے .... پچھلی حیاتی کے کنوئیں میں سے پانی کے ڈول نکال نکال کر ہموار اور پیاسے میدان پر ڈالتے رہے اور تب انہیں گیان ہوا کہ اُن دونوں کی سانجھ اس میدان میں شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ تو پچھلے زمانوں سے چلی آ رہی تھی .... وہ ہمیشہ سے ساتھی تھے .... اُن کی ہڈیوں پر وار کرنے والی چونچیں ایک تھیں اور اسی لئے اُن کی ہڈ بیتی ایک تھی .... یہی تو اُلجھاؤ تھا .... کہ اِن میں بندا کونسا ہے اور پکھیرو کون ہے؟ پکھیرو کون ہے اور بندا کونسا ہے؟

لیکن اس اُلجھاؤ سے کیا فرق پڑتا تھا؟ .... وہ باتیں کرتے رہے۔



۱۹

بندا : تم نے مجھے اپنا بھید بتا دیا ہے اور میں نے تمہیں اپنا .... لیکن تم نے مجھے ابھی تک اپنی پوری کتھا نہیں سنائی .... تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ جب تم ڈار سے الگ ہوئے .... سی مرغ کے سامنے پیٹ کو بھی سچ قرار دیا ..... اُس کے بعد تم نے کہاں پرواز کی .... پرواز کی بھی یا گدھوں کے ہتھے چڑھ کر یہاں پہنچ گئے ؟

پکھیرو : (چونچ کھول کر ہنستا ہے۔) میں نے تمہاری طرح پہلی مرتبہ ہی ہتھیار نہیں پھینک دیئے تھے۔

بندا : (دل میں) طعنے دے رہا ہے پکھیرو کا بچہ ....

پکھیرو : مجھے اپنے آپ پر مان تھا .... پکھیرو ہونے کا .... میں اُن پکھیروؤں سے جُدا ہو گیا (اور یوں اُن کے سچ کا برتن بھی توڑ دیا کیونکہ اب وہ صرف اُنتیس تھے .... اور سچ تو تیس پکھیروؤں کا نام تھا) .... اور سمندروں کے اُوپر اُڑان کرنے والے پکھیروؤں سے جا ملا (وہ سیانے تھے اور سی مرغ

کی تلاش میں شامل نہیں ہوتے تھے) ....

میں نے بے شمار زندگیاں اُن کے ساتھ اُڑان میں گزار دیں ....

لیکن میں الگ ہی رہا (میرے اندر ایک بے چینی تھی)

وہ صرف پکھیرو تھے ....

میں بھی پکھیرو تھا (لیکن نہیں بھی تھا)

میں نے ہمیشہ آسمانوں کو دھیان میں رکھا ....

اُڑانیں کیں

آہستہ آہستہ اتنا اونچا اُڑا ....

اتنا اونچا .... مجھ سے پہلے کوئی پکھیرو نہیں اُڑا تھا۔

(میں نے مشق کر لی تھی)

ہوا کا رُخ ، پروں کا زاویہ ، سانس سنبھالے رکھنا۔

کسی پکھیرو نے آج تک اِن باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

میں نے دھیان دیا ، دھیان کیا۔

میں اپنے دماغ کو کام میں لایا .... اور اُس نشے کے آگے

اپنے کومل بدن کے ساتھ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا ....

جسے قدرت کہتے ہیں .... (بس مقابلے پر آ گیا)

ایک روز ....

میں زمین پر واپس آیا تو دوسرے پکھیروؤں سے کہا ....

"مچھلیاں نگل کر .... سمندری گھاس سے پیٹ بھر کے .... بیٹ کر دینا

پھر پیٹ بھرنا ، بیٹ کر دینا .... حیاتی نہیں ہو سکتی

سمندر پر زیادہ سے زیادہ ....

میل دو میل کی بلندی تک پرواز کر کے، لوٹ آنا
حیاتی نہیں ہو سکتی۔
ہم اس سے کہیں زیادہ بلندی پر پہنچ سکتے ہیں....
پرواز کرتے ہوئے عرشوں میں چھید کر سکتے ہیں....
حیاتی پرواز کا نام ہے....
اگر تمہیں سچ کی تلاش ہے تو آؤ
میرے ساتھ پرواز کرو"
پکھیرو میری بات سُن کر ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے۔
(کئی قہقہے لگاتے لگاتے سمندر میں ڈوب گئے۔)
کسی نے بھی مجھے سنجیدگی سے نہ لیا....
انہوں نے کہا.... یہ پاگل ہے۔
پکھیرو کا کام ہی یہی ہے کہ
کھانا اور بیٹ کر دینا....
قدرت کی جانب سے معیّن کردہ بلندی تک جانا اور واپس آجانا....
ہمارے آباؤ اجداد بھی یہی کچھ کرتے رہے....
یہی سچ ہے.... پیٹ بھرنا
یہی سچ ہے.... بیٹ کرنا
قدرت کے قانون کے خلاف کوئی پرواز نہیں کر سکتا۔

بندا : پھر کیا ہوا؟
پکھیرو : پھر میں تنہا رہ گیا تمہاری طرح
بندا : پھر گدھ تمہارے پیچھے پڑ گئے؟

پکھیرو : نہیں .... ابھی نہیں
میں دوسرے پکھیرؤوں سے الگ ہوا اور....
پرواز کرنے لگا....
اپنے پَروں کو اِک ایسے زاویے پر رکھا کہ
آسمان میں تارا ہو گیا۔

بندا : (دل میں) یہ مجھے "جونا تھن لِونگ سٹون سی گل" کا قصہ سنانے لگا ہے۔
پکھیرو : (دل میں) میں "جونا تھن لِونگ سٹون سی گل" بھی ہوں لیکن اُس سے مختلف
.... میں فاختہ، طوطا، چڑیا، باز یا سمندری پرندہ نہیں ہوں صرف پکھیرو
ہوں .... وہ میں نہیں لیکن میں وہ سب ہوں....
میرے پَروں تلے.... سمندر سُکڑنے لگا (جُوں جُوں میں بلند ہوتا گیا)
پھر زمین نے اُس کے گرد گھیرا ڈال لیا....
اور پھر بالآخر یہ زمین کل کائنات میں....
ایک گولے کی طرح گھومتی دکھائی دی....
کسی بچے کے گمشدہ گیند کی طرح دکھائی دینے لگی۔
میں نے سوچا، میرا وجود....
اِس گیند کے مقابلے میں....
کتنا حقیر اور بے وقعت ہے....
میں اِنہی خیالوں میں گم رہا.... اور
پَروں کی جانب سے غافل ہو گیا....
اُن کے زاویے کی طرف دھیان نہ کیا.... اور
میں گرنے لگا۔

میرے نیچے خلا میں ٹنگے گیند کا حجم....
آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔
آس پاس کی کائنات ختم ہوگئی.... صرف زمین رہ گئی۔
گیند بڑا ہوتا گیا....
پھر سمندر دکھائی دیا اور وہ بھی بڑا ہوتا گیا....
بالآخر ایک ایسی حد آگئی،
جس کے ایک جانب کچھ بھی نہ تھا.... خلا!
اور دوسری طرف.... زمین کی کشش تھی۔
میں نے یہ سرحد پار کی اور زمین نے مجھے کھینچا....
(تمہیں تو معلوم ہے کہ زمین کی کشش ہمیشہ مجھ پر غالب آئی)
میں اِس کشش کے آگے بے اختیار ہوگیا۔
میرے پروں میں پہلے ہواؤں نے گھونسلے بنائے اور پھر
انہیں چھید دیا....
میں ایک بگولے کی طرح شوکتا ہوا نیچے آیا....
قلا بازیاں کھاتا ہوا، بے بس اور بے اختیار....
اور سمندر پر اس طرح آ گرا
جیسے میں پروں کی ایک مٹھی نہیں ہوں،
لوہے کی اینٹ ہوں....
میں گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا

بندا : لیکن تم تو اچھے بھلے صحیح سالم ہو!

پکھیرو : تمہیں اسی طرح دکھائی دیتا ہوں، جُڑا ہوا، صحیح سالم.... لیکن سامنے کچھ ہوتا ہے اور دکھائی کچھ اور دیتا ہے.... آنکھوں کا دھوکہ....
تمہیں میں سالم دکھائی دیتا ہوں لیکن میں ٹکڑے ٹکڑے ہوچکا ہوں
.... میں نے بے انت موتوں کو چکھا اور اَن گنت بار زندہ ہوا۔

بندا : (عنقا کی طرح تمہاری موت بھی تمہاری زندگی کا آغاز ثابت ہوتی ہے۔)

پکھیرو : میں ٹکڑے ٹکڑے ہوچکا ہوں۔

بندا : میں بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوں.... مرچکا ہوں.... لیکن تمہارا یہ حشر تو اس لئے ہوا کہ تم سچ کی تلاش میں تھے.... اور میں.... بیٹھے بٹھائے ہی ختم ہوگیا۔

پکھیرو : بیٹھے بٹھائے کوئی ختم نہیں ہوتا.... میں نے اپنے پروں کے ساتھ ایسی پرواز کی جو میرے بس سے باہر تھی اور تم نے اپنے دماغ پر سوچوں کا بوجھ لاد دیا.... بیٹھے بٹھائے کوئی ختم نہیں ہوتا....

بندا : میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟

پکھیرو : بتاؤ....

بندا : میرے اندر بھی تیری طرح کا ایک پکھیرو رہتا ہے (شاید تم ہی....)

پکھیرو : (ہاں وہ میں ہی ہوں)

بندا : اُسے بھی سچ کی تلاش ہے.... وہ بھی روٹین سے فرار چاہتا ہے (وہی پیٹ بھرنا اور بیٹ کرنا) وہ بھی معاشرے سے جدا ہو کر ختم ہوگیا ہے

پکھیرو : اِسے (یا مجھے) باہر کیوں نہیں نکالتے؟

بندا : یہ میرے بس میں نہیں ہے.... اُس کے آس پاس دیواریں ہیں۔
(سفید دیواریں) میرے وجود کی دیواریں۔

پکھیرو : ان دیواروں کو ڈھا دو....

بندا : لیکن یہ دیواریں میں نے تو بلند نہیں کیں .... دوسروں نے کی ہیں
یہ پکھیرو اِن سے سر ٹکرا ٹکرا کر ادھ موا ہو چکا ہے .... پہلے پہل
مجھے اُس کے ہونے کا پختہ یقین تھا .... لیکن اب تو ایک عرصے سے
اُس کے پروں کی سنسناہٹ سنائی نہیں دی، کیا پتہ مر چکا ہو۔

پکھیرو : ایسا مت کہو .... اگر وہ پکھیرو مر گیا تو تم بھی مر گئے۔

بندا : میں تو مر ہی چکا ہوں۔

گِدھ : (دل میں) اگر تم مر چکے ہوتے تو ہم تمہیں کھا چکے ہوتے .... ہم تمہیں
کھا چکے ہوتے .... ہم انتظار کر رہے ہیں تمہارے مرنے کا .... تم دونوں
کے مرنے کا۔



۲۰

اُن اُجاڑ خاموشیوں میں کبھی بندے کی بھاری آواز اُس جہان میں اُس پر ہونے والے مظالم کی پہچان کرتی اور کبھی پکھیرو کی کُوک چاروں طرف پھیلتی اور اپنے پَروں پر گرتی مصیبتوں اور دُکھوں کا قصّہ سناتی .... خاموشیاں ٹوٹتیں .... جڑ جاتیں .... ٹوٹتیں اور پھر جُڑ جاتیں .... ٹُنڈ سدا کا چُپ تھا .... چُپ ہی رہا .... چُپ چاپ سُنتا رہا (کیونکہ وہ سُن سکتا تھا)

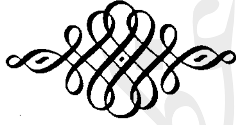
جب سانجھ ہو .... دوستی کی بنیاد ہو .... تب گدھوں کی چونچیں بھول جاتی ہیں .... جونکوں کی جلن کم ہو جاتی ہے .... پَروں کے خون میں بھیگے ہونے کا دھیان نہیں رہتا .... وہ دونوں باتیں کرتے رہے .... اپنے دُکھ سُکھ سناتے رہے۔

صبح ہوتی تو سورج کی روشنی کی پہلی لکیر، پکھیرو کی چونچ پر زرد سرسوں کی طرح پھولتی .... بندے کے ہونٹوں پر سنہری مچھلی کی طرح تیرتی .... اُس کی چونچ کھلتی .... اُس کے ہونٹ ایک دوسرے سے جُدا ہوتے .... پھر وہ باتیں کرتے .... کل جہان کی باتیں .... اُس جہان کی جہاں سے وہ بھاگ آئے تھے یا بھگا دیے گئے

تھے ..... اور اِس جہان کی جہاں اُن کی اصل حیاتی کا آغاز ہوا تھا .... صبح کے بعد
دوپہر کے الاؤ جلتے ..... لیکن اُس کی چونچ، اُس کے ہونٹ بالکل نہ سوکھتے .....
بلکہ سانجھ کے پانیوں سے اور زیادہ تر و تازہ ہو جاتے ..... وہ ہراساں تھے کہ کہیں
وقت گذر نہ جائے .... اُن میں ایک بے اعتباری تھی کہ اگر وقت ختم ہو گیا اور باتیں
ختم نہ ہوئیں تو .....

وہ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں بھی کرتے اور اِس کے ساتھ ساتھ اپنے
اندر جھانک کر اپنے آپ سے سوال جواب بھی کرتے جاتے .. سوال وہ وجود کے نہاں
میں کرتے اور جواب کی کشتی دوسری جانب سے تیرتی ہوئی آ جاتی .... بات جسم کی
تاریک کوٹھڑی میں سے جنم لیتی اور وہ دوسرے کے لبوں میں سے مکمل ہو کر باہر آ
جاتی .... ایک کہتا کہ دیکھو اس کنوئیں میں جھانکو اس کے پانی ٹھنڈے ہیں اور الاؤ بجھا
سکتے ہیں اور دوسرا اُس میں ڈول بن کر اُتر جاتا اور پانی نکال نکال کر پہلے پر ڈالنے لگتا...
اور یوں ایک اور دوسرے کا فرق ختم ہوتا گیا .... ایک جو کہانی سناتا وہ دوسرے
کی ہوتی .... دوسرا جو قصہ سناتا وہ تو پہلے کی آپ بیتی ہوتی .... اُن دونوں کی باتیں
ایک جیسی ہو گئیں .... اور اب اگر سردی کا برف سانپ ایک کے وجود کے ساتھ لپٹتا
تو کپکپی دوسرے پر طاری ہو جاتی .... دوسرے کا جسم اگر تپتی ہواؤں سے جھلس جاتا
تو ایک کا وجود تپش سے سوکھ جاتا ۔ ساون بھادوں کے حبس میں اگر ایک کے اندر
پسینے کا قطرہ ٹپکتا تو دوسرے کے جسم میں سے یوں دھاریں پھوٹتیں جیسے اعلیٰ نسل کی بھینس
کے تھن کو چھونے سے ہی دودھ بہنے لگتا ہے .... وہ ایک تھے .... وہ باتیں کرتے
رہے ..... کرتے رہے اور بالآخر ایک ایسا لمحہ آیا کہ .... باتیں ختم ہو گئیں .... پکھیرو
کی چونچ بند ہو گئی .... بندے کے ہونٹ سِل گئے .... اب کوئی ایسی بات، کوئی

قصہ کہانی ایسی نہ تھی جو اُس چونچ اُن ہونٹوں میں سے نہ نکلا ہو .... وہ چُپ ہو گئے
.... اپنے آس پاس کے اُجاڑ میدان کی طرح چُپ .... چُپ .... ٹُنڈ کی کا
چُپ .... چُپ! چُپ! چُپ!



(۲۱)

چُپ کا ایک دن ....

بندا : (پکھیرو کہاں گیا؟) میں تو آپ ہی اپنے سامنے کھڑا ہوں .... آئینے میں .... بندا ۔

پکھیرو : (بندا کہاں گیا؟) میں تو آپ ہی اپنے سامنے کھڑا ہوں .... آئینے میں .... پکھیرو ۔

(۲۲)

چُپ کا ایک اور دن ....

بندا : میرے سامنے کچھ بھی نہیں ۔

پکھیرو : میرے سامنے کچھ بھی نہیں ۔

(۲۳)

ایک پَر ....
پروں کی پوٹلی میں سے گِرا ....
پکھیرو کے وجود سے الگ ہوا ....
اور بندے کے پاؤں میں آگرا۔
سائیں کا مَچ
بندے کے دل میں سُلگتا سائیں کا مَچ سرد پڑنے لگا۔
شعلے دھیمے ہونے لگے
الاؤ کی جگہ، راکھ کے بادل
دل پر بیٹھنے لگے،
ٹُنڈ میں سے
دُھوئیں کی ایک لکیر لہراتی ہوئی نکلی،

جیسے کالا ناگ پٹاری میں شوکتا ہوا نکلے،
اور پھر ٹُنڈ کے سُوکھے ہوئے بازوؤں اور پاؤں میں سے
بڑے بڑے تُمّے[1] پھُوٹنے لگے۔
پکھیرو کا ایک اور پَر جھڑ گیا ....
بندے کے دل کا مَچ اور مدھم ہو گیا۔
ٹُنڈ میں سے تُمّے پھوٹتے رہے
جیسے برسات میں زمین میں سے بیر بہوٹیاں
پھوٹتی ہیں۔
ایک اور پَر گِرا۔
آہستہ آہستہ بندے کے پاؤں کے آس پاس
پَروں کا ڈھیر بن گیا۔
اُس نے اپنے ساتھی، پکھیرو کی جانب دیکھا۔
پَروں کے بغیر ماس کی پوٹلی ....
اُڑانوں کے دن ختم ہوئے ....
کیونکہ پَروں کے بغیر تو وہ نرم گوشت کا ....
ایک چھوٹا سا گولا تھا .... پکھیرو نہ تھا۔
پکھیرو کے پنکھ نہ ہوں تو وہ پکھیرو کیسا؟
اُس روز ....
بندے کو محسوس ہوا کہ ....

---

[1] آک کے پودے کی کلیاں

سردی تمام حدیں عبور کرتی چلی جاتی ہے ....
دل کی تپش بھی سردی کے قریب پہنچ کر ....
ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے ۔

اور یوں سردی کا برف ہاتھ اُس کے دل کی جانب ....
بڑھنے لگا ....

دل کے دروازے توڑنے لگا۔
اور بالآخر سائیں کا مچ بجھ گیا، ٹھنڈا ہو گیا۔
سردی کے برف ہاتھ اُس کے دل پر پھیل گئے۔
اُسے اپنی گرفت میں لیا ....

اور اپنے جیسا کر دیا، ٹھنڈا یخ .... اور برف ۔
"یہ کیا ہو رہا ہے ؟" اُس نے کانپتے ہوئے دل سے پوچھا ۔
دل نے ڈوبتے ہوئے جواب دیا "میں مرنے کو ہوں ....
میری گرمی ختم ہوئی، زمین میں سے نکلنے سردی کے ہاتھ نے ....
مجھے ٹھنڈا کر دیا ہے ۔
میں نے ایک عرصہ تمہارا ساتھ دیا لیکن اب میں بھی تھک ہار کر
ٹھنڈا ہو گیا ہوں ....
تم اب اپنا خیال خود کر دیکھو ...."
اور پکھیرو ....
جس کے پیروں کو ٹنڈ نے ہمیشہ زمین سے چوسی ہوئی حدت
پہنچائی تھی ....
آج وہ ٹنڈ بھی یخ پڑا تھا ....

کیونکہ زمین کی حدت ختم ہو چکی تھی
پکھیرو کا بدن .... پروں کے بغیر بدن
سردی کے ہاتھوں بے اختیار ہو چکا تھا،
اس طرح کانپتا تھا جیسے ابھی ٹنڈ سے گرا ....
ابھی گرا ....
وہ اِس طرح لرزتا تھا۔ جیسے ابھی ٹنڈ سے گرا ....
ابھی گرا ....
وہی پکھیرو، جو بھی مرغ کی تلاش میں
ایسی وادیوں میں سے گذرا تھا ....
جہاں زمین کے وجود کے پہلے دن ہی .... اس کے چہرے پر ....
گہری برفوں کے گھونگھٹ پڑ گئے تھے ۔
جہاں لاکھوں پکھیروؤں کا خون برف ہوا ....
جہاں پروں کے گیند، برف کے گولے بنے ....
اور مر گئے ....

وہاں، وہ زندہ رہا ....
اُسے اُس کے اندر کی حدّت نے ہمیشہ بچا لیا ....
اِس حدّت کے سامنے برف کے برچھے پگھل گئے
اور وہ .... زندہ رہا
لیکن آج ....
"آج یہ کیسی سردی ہے ؟" اُس نے ٹھٹھرتے ہوئے سوچا۔
"جس نے اُجاڑ میدان میں سے پھوٹ کر ....

ٹُنڈ کے بازوؤں اور پاؤں کے راستے ....
میرے جسم کو چھید دیا ہے"
پکھیرو کے اندر کی حدت بھی ....
ختم ہو گئی۔
کُل جہان کے کل پکھیرو .....
وہ جن کے نام تھے اور وہ جو بے نام تھے ....
اُس کے سامنے اُڑان کرنے لگے ....
چکی رٓا ... مور .... بلبل .... سمندری پکھیرو .... بی مُرغ ....
اور سب سے آخر میں ....
وہ آپ اپنے سامنے آ گیا .... پکھیرو۔
جس روز وہ اِس میدان میں اُترا تھا ....
اُس روز اُس کے بدن میں اُترنے والی چونچوں کی اذیت ....
آج .... اِس وقت، اس کے جسم میں بُلبُلوں کی طرح ....
پھٹنے لگی۔
بندے کے اندر سائیں کا پچ ختم ہوا تو اُس کے بدن پر بھی ....
اِس میدان میں گذرے ان گنت برسوں کے نشان ....
ظاہر ہونے لگے ....
اُس کے بال ایک لمحے میں سفید برف ہوئے اور
پھر ایک ایک کر کے جھڑنے لگے ....
سارے جھڑ گئے (پروں کی مانند)
آنکھوں کے آگے پپوٹوں کا ماس ڈھیلا ہو کر لٹک گیا ....

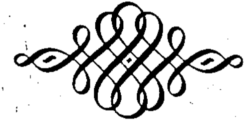
اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔
اُس کی کمر ٹوٹ گئی ....
اور وہ کُبڑا ہونے لگا .... جھک گیا .... جُھکتا گیا ....
آہستہ آہستہ اُس کے ہونٹ زمین کے نزدیک ہوتے گئے ....
آنکھوں کے سامنے مُردہ ماس کی دیوار اُترنے سے پہلے ....
اُس کے سامنے ....
ایک سفید دیوار اُبھری ....
زمین سے شروع ہو کر عرش تک پہنچتی ہوئی ....
دیوار کے سفید کینوس پر گذشتہ زندگی کی تصویریں ظاہر ہوئیں ....
احمے جولاہے کا گدھا ....
مینڈک کا بچہ۔ کرتلی .... چاچا ....
گدھ .... گھر والی .... بچے .... گدھ،
دوست یار اور جنازے،
لاکھوں جنازے .... کلمۂ شہادت .... گدھ
یہ تمام تصویریں منتشر ہو گئیں اور صرف ایک تصویر ....
باقی رہ گئی ....
وُہ آپ اپنے سامنے آ گیا .... بندا۔
اُس کے جسم میں سے جونکوں کی جلن .... نے سر اُٹھایا۔
چونچوں کی اذیت پھوٹی ....
پکھیرو کانپا .... زمین کی کشش تھی ....
وہ نیچے آن گرا۔

اُس نے اپنی چونچ زمین کے اُوپر رکھ دی اور آہستہ آہستہ چونچ زمین کے اندر چلی گئی.... واپس اپنی زمین میں۔

بندا بے قابو ہو گیا.... زمین کی کشش تھی....

اُس کے ہونٹ زمین کے ساتھ لگ گئے.... اور آہستہ آہستہ وہ ہونٹ زمین کے اندر چلے گئے.... واپس اپنی زمین میں ٹُنڈ پر لگے تموں کے مُنہ اچانک کُھل گئے.... اُن میں سے لاکھوں مائی بوڑھیوں نے اپنے سفید کفن سر نکالے اور اُس اُجاڑ میدان کے اُوپر بکھرنے لگیں.... اس بے حساب.... ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کہیں.... اُس ہموار میدان پر اُڑنے لگیں.... اُس روز کی طرح جب راجے جولاہے کا گدھا آک کے پودوں کے درمیان اوندھا پڑا ہوا تھا اور اُس کی جانب گِدھوں کی چونچیں بڑھ رہی تھیں۔

ایک گدھا، گدھا۔



۲۴

دونوں گِدھوں نے نیچے دیکھا.... وہی بندا.... ایک ٹُنڈ.... اور ٹُنڈ کے قریب بکھرو.... چاروں طرف اُجاڑ میدان میں اکلاپے کا راج....

....

ایک گِدھ نے دوسرے گِدھ سے کہا"... وقت آگیا ہے"

اور دونوں نے اپنی چونچیں زمین کی جانب کیں اور پر پھیلا دیئے۔

ایک گِدھ نے دوسرے سے کہا "نیچے دیکھ۔"

دوسرے گِدھ نے پَر پھیلائے "کچھ بھی نہیں .... وہی اُجاڑ میدان ہے ... میدان ہے .... اور .... اور"

پہلے گِدھ نے ڈکار لیا "اور .... اور؟"

"وہی اجاڑ میدان ہے لیکن ...." دوسرے گِدھ کی چونچ پر پسینہ آگیا۔

"لیکن اب وہاں .... ایک اور بندا کھڑا ہے۔"

"بندا ...." پہلے گِدھ نے چونچ کٹکٹائی۔ "بندا تو ہم نے نوچ کھایا .... ہماری گردنیں ابھی تک اُس کے خون سے نچڑ رہی ہیں .... دراصل تم زیادہ کھا گئے ہو اور اسی لئے تمہیں وہاں بندے کا شبہ ہو رہا ہے ...."

"نہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں .... شبہ نہیں ہو رہا .... وہاں سچ مچ ایک اور بندا کھڑا ہوا ہے۔"

۲۵

فاختہ

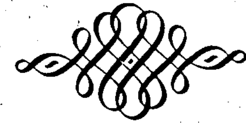
اب کے سرخ چوک کے آخیر میں واقع کلیسائے سینٹ باسل کے پیاز نما گنبدوں کے عین وسط میں ایک گلرنگ انار چھوٹا۔ سُرخ گنبد ایک لمحے کے لئے پیلے پڑ گئے۔

آج ماسکو کے "کراسنایا پلوشت" یعنی سُرخ چوک میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ رُوسی موسیقی کی تانوں پر تھرکتا، شراب کے نشے میں جھومتا گاتا ایک سیلِ بے کراں تھا جو چوک سے نکلنے والی سڑکوں سے باہر اُبل رہا تھا۔ ہزاروں انسانی جسموں نے سُرخ چوک کو اپنے اندر سمو کر اس کی عظیم وسعت کو بے معنی بنا کر رکھ دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے چاروں اور کھڑی عمارتیں کریملن، لینن کا مقبرہ، گم ڈیپارٹمنٹل سٹور، کلیسائے سینٹ باسل، روسی عوام کا عجائب گھر اور گورکی سٹریٹ ہجوم کی گرمئ شوق سے موم ہو کر پگھل جائیں گی اور اس کے بعد یہ سمندر پورے ماسکو کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ انسانی آوازوں کے شور اور موسیقی کی دھمک سے کریملن کا

آئیون مینار اوندھا ہو جائے گا۔

ہر چند منٹ ماسکو کا نیلا آسمان گولوں، پٹاخوں، اناروں، پھول جھڑیوں اور ہوائیوں کی آتشبازی چھوٹنے سے کسی تجریدی شاہکار کی مانند رنگین اور شوخ ہو جاتا۔ سپالسکایا مینار کی چوٹی پر نصب سُرخ ستارہ جھلملانے لگتا۔ آتشبازی کی آواز سے اپنے آپ میں مگن ہجوم چونک اُٹھتا اور لمحہ بھر کے لئے خاموش پڑ تا۔ نظریں آسمان پر لگ جاتیں۔ لیکن جونہی آخری شرارہ بھڑک کر بجھتا پھر وہی شور اور موسیقی کی تانیں عود کر آتیں۔

سُرخ چوک کے عین درمیان میں ایک عظیم الاؤ روشن تھا جس کے جلنے کی گڑگڑاہٹ کبھی کبھار تمام آوازوں پر حاوی ہو جاتی۔ بے شمار لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے اس الاؤ کے گرد ایک دائرے کی صورت میں ناچ رہے تھے۔ الاؤ کی جلتی بجھتی روشنی میں ان کے چہرے بے حد ہیبت ناک لگ رہے تھے۔ اس میں شامل تمام چہرے ساکن تھے۔ منجمد تاثرات کے پیکر۔ نقاب پوشوں کا جشن۔ آج جشن کی رات تھی۔



صرف تین ہفتے قبل جب میں نوٹنگھم میں اپنے کالج کی لائبریری میں داخل ِاتو نوٹس بورڈ پر سُرخ رنگ کا ایک اشتہار آویزاں تھا۔

"نوجوانوں کا پانچواں عالمی میلہ اس سال ماسکو میں منعقد ہو رہا ہے۔ اگر آپ کی رِ پچیس سال سے کم ہے اور آپ عالمی امن اور بھائی چارے کے اعلیٰ و ارفع مقاصد ِصدقِ دل سے یقین رکھتے ہیں تو میلے میں شمولیت کے لئے مندرجہ ذیل پتے پر ِخواست روانہ کیجئے"

اشتہار کے آخر میں چیکوسلاواکیہ کی کسی انجمن کا پتہ درج تھا۔

"عمر کی شرط تو ابھی میں مزید آٹھ سال تک پوری کرنے کا اہل رہوں گا لیکن یں عالمی امن اور بھائی چارے کے اعلیٰ و ارفع مقاصد پر صدقِ دل سے یقین رکھتا ِل ہوں" میں نے لائبریری کے کونے میں سمٹی بیٹھی ایک معنک لڑکی کا جائزہ لیتے ہوئے ِچا۔ لڑکی نے سر اُٹھا کر میری جانب دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کے اگلے دو دانتوں میں ن لگا ہوا تھا۔ میں نے فوراً فیصلہ دے دیا کہ میں ان مقاصد پر بالکل یقین رکھتا

ہوں جب کہ یہ مقاصد نوٹنگھم میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کی بجائے ماسکو جانے سے ہی پورے ہو سکتے ہوں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا تھا کم از کم روس دیکھنے کا موقع تو مل جائے گا۔ روس جس کے چاروں طرف تنا آہنی پردہ اُن دنوں اتنا زنگ آلود نہ تھا جتنا ان دنوں ہے۔

کالج سے واپسی پر میں نے ہوسٹل میں ابلے ہوئے آلو گوشت کا گاڑھا اور بدمزہ مرکب نگلا اور پھر اپنے کمرے میں جا کر اشتہار پر درج شدہ پتے پر اپنی درخواست روانہ کر دی۔ درخواست کو جاندار بنانے کی خاطر میں نے ہر دوسری سطر میں عالمی امن اور بھائی چارے کے مقدس الفاظ استعمال کئے جن کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ایک ہفتے بعد مجھے مطلع کیا گیا کہ نوجوانوں کی بین الاقوامی انجمن نے مجھے ماسکو کے میلے میں شرکت کرنے والے برطانوی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے منتخب کر لیا ہے۔ روس میں داخلے کے لئے روسی حکومت خصوصی پاسپورٹ جاری کرے گی اور مجھے صرف آہنی پردے کی دہلیز تک کا ریل کا کرایہ ادا کرنا ہوگا۔ اس سے پَرے تمام اخراجات برائے سفر اور رہائش روس کے محنت کش عوام کے ذمے ہوں گے۔ روسی محنت کش عوام کے لئے میرے دل میں جو عزت تھی اُس میں فی الفور گرانقدر اضافہ ہو گیا۔ میں موم ہو رہا تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اُنہی دنوں چند پاکستانی لڑکوں نے لندن یاترا کے لئے آئے ہوئے پاکستانی وزیر اعظم سے ایک ملاقات کے دوران میں درخواست کی کہ ماسکو جانے والے برطانوی وفد میں شامل سینکڑوں پاکستانیوں کو روس پہنچ کر سرکاری طور پر پاکستان کی نمائندگی کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ موصوف اُنہی دنوں تازہ تازہ امریکہ میں رقص کے مختلف انداز میں تصویریں کھنچوانے کے علاوہ نہر سویز کے بحران کے دوران میں عربوں کے لئے "زیرو جمع زیرو برابر ہے زیرو" کا تاریخی جملہ ادا کر کے

پاکستانی عوام کے جذبات کی "ترجمانی" کر چکے تھے۔ چنانچہ روس کا نام سنتے ہی بھڑک اٹھے اور سختی سے تنبیہہ کی کہ خبردار اگر کسی پاکستانی لڑکے نے ماسکو جانے کا نام لیا۔ روس ہمارا دشمن ہے اور جو شخص کسی طور بھی روسیوں سے راہ و رسم بڑھائے غدارِ وطن ہے۔ آپ لوگ اس وقت لندن میں ہیں اس لئے سرکاری طور پر تو میں آپ کو نہیں روک سکتا۔ بڑے شوق سے ماسکو جائیے مگر اتنا یاد رکھیئے کہ کبھی نہ کبھی تو آپ پاکستان واپس لوٹیں گے اور پھر دیکھئے گا کہ آپ سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔

وفد میں شامل اکثر پاکستانی لڑکے فوراً کچھ جذبۂ حب الوطنی کو مدنظر رکھتے ہوئے اور بیشتر میانوالی جیل کی کال کوٹھڑی کے تصور سے اپنی اس نازیبا حرکت سے باز آ گئے۔ میں چونکہ اُن دنوں نوٹنگھم میں قیام پذیر تھا اس لئے مجھے اس نادر شاہی الٹی میٹم کی خبر نہ ہو سکی ورنہ جذبۂ حب الوطنی تو مجھ میں بھی تھا اور خاص طور پر جب اپنے ملک کا وزیر اعظم اِسے کوٹ کوٹ کر بھرے تو نشہ دو چند ہو جاتا ہے۔ بہر حال چند نوجوان ایسے بھی تھے جنہوں نے اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر قبول نہ کیا اور بہر صورت ماسکو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دلیرانہ فیصلے میں اُن کے دل گردے کی مضبوطی کا چنداں دخل نہ تھا بلکہ وہ پاکستان کے اُن پیشہ ور سیاسی گھرانوں کے چشم و چراغ تھے جو نظریاتی طور پر چاہے کسی بھی دھڑے سے متعلق ہوں انہیں معلوم تھا کہ وطن واپسی پر اُن کی اس "غداری" پر کوئی پُرسش نہ ہو گی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو وطن میں مالی طور پر اتنے مستحکم تھے کہ اُن کی لغزش بھی "منے آئندہ مت کرنا" کے کھاتے میں بڑی آسانی سے ڈالی جا سکتی تھی۔

میرے جیسا للو پٹھ بے خبری کے عالم میں ان جائنٹس کی جلو میں ہو لیا۔

لندن کے وکٹوریہ سٹیشن اور ماسکو کے بیلوروسکی سٹیشن کے درمیان تین روزہ مسافت کے دوران میں بالترتیب رود بارِ انگلستان، بلجیم، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، پولینڈ

اور مغربی روس میں سے گزر ہوا۔

پولینڈ کے ایک سٹیشن پر گاڑی رکی تو پلیٹ فارم پر لگے نلکوں میں سے پانی کی بجائے بیئر برآمد ہوئی۔ بیئر کے اس سیلاب کا ذخیرہ کرنے کے لئے اکثر حضرات کو اپنی تھرماسوں کی تنگ دامنی کا احساس ہوا اور گئے وقتوں میں چمڑے کے مشکیزوں کا استعمال نہایت دلفریب معلوم ہوا کہ جن میں دس بیس گیلن شراب نہایت آسانی سے ذخیرہ کی جا سکتی تھی۔ شکر ہے انجن ڈرائیور نے صرف اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے پر ہی اکتفا کیا ورنہ اگر وہ بھی گاڑی میں سوار اکثر مسافروں کی مانند خوب سیر ہو کر بیئر نوش کرتا۔ بار بار انجن کی وہسل بجا کر خوش ہوتا اور پھر پاؤں پسار کر گوٹلوں والی بوگی میں سو رہتا تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ گاڑی چلی تو تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکوں نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ وہ چند حضرات بھی جو سٹیشن کے عملہ کی مدد کے بغیر گاڑی میں سوار ہوئے تھے اپنے لبوں پر نیم مسکراہٹیں سجا کر جہاں تھے وہیں لمبے پڑ گئے۔ اس شب ہماری گاڑی میں ہُو کا عالم طاری تھا۔

ماسکو کے بیلورُسکی سٹیشن کو ہماری آمد کی خوشی میں دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ افسرانِ بالا ہمیں خوش آمدید کہنے کے لئے بنفسِ نفیس موجود تھے۔ دھواں دار تقاریر ہوئیں۔ پھولوں کے گلدستے پیش کئے گئے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا عملہ ہمارے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ غرضیکہ وی۔ آئی۔ پی حضرات والی مکمل خوراک، موقع غنیمت جان کر میں نے بھی ایک بیان جاری کر دیا "ہمسائے ہونے کی بنا پر دونوں ملکوں میں برادرانہ تعلقات کی اہمیت پر زور ثقافتی رشتے۔ تجارتی ....." وغیرہ۔ بعد میں میرے یہ سنہری الفاظ ریڈیو ماسکو سے نشر کئے گئے۔ سٹیشن پر ہی برطانوی وفد میں شامل درجن بھر پاکستانی لڑکوں نے ایک علیحدہ وفد کی تشکیل کر کے پاکستان کی غیر سرکاری طور پر نمائندگی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

روسی حکومت نے ہمارے قیام کا انتظام "ہوٹل ذو لوتوئی کولس" میں کیا اور سند کے طور پر دو روسی مترجم والنتینا اور لیونا ساتھ کر دیئے جو اتنی نستعلیق قسم کی اُردو بولتے تھے کہ وفد میں شامل اکثر حضرات گڑبڑا کر اُن سے انگریزی میں گفتگو شروع کر دیتے ایک روز میں نے اپنے کیمرے کے لئے فلم خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو گول مٹول چہرے والی قبول صورت والنیتا نے اِٹھلا کر کہا "صاحب فلم کا لفظ تو انگریزی زبان میں مستعمل ہے۔ اجی حضرت فیتہ کہیئے فیتہ!" اس خالص لکھنوی انداز سے ان کا دھیان اِدھر اُدھر ہوتا بھی تو فیض کے شعر ترنم سے گنگنانے لگتے۔

اور آج صبح دنیا کے وسیع ترین لینن سٹیڈیم میں نوجوانوں کے پانچویں عالمی میلے کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ سینکڑوں ممالک سے آئے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے وفد جلوس کی صورت میں سٹیڈیم میں داخل ہوتے اور حاضرین کے پر خلوص نعروں کا جواب دیتے ہوئے متعینہ جگہوں پر جا بیٹھتے۔ جب میں اپنے مختصر وفد کے آگے آگے پاکستانی پرچم ہاتھ میں تھامے سٹیڈیم میں داخل ہوا تو پورا سٹیڈیم "روس پاکستان دوستی زندہ باد" کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ ایک ایسی گونج جس کی بازگشت "زیرو جمع زیرو برابر ہے زیرو" فیم وزیراعظم کے ایوانوں میں بھی سُنی گئی ہوگی اور پھر ہمارے وفد میں شامل ایک لمبا تڑنگا لڑکا آگے بڑھا اور مجھ سے پرچم چھین لیا۔

"تم بہت چھوٹے ہو"

اس نے درشتگی سے کہا اور اپنا ۵۵۵ کا امریکی سگریٹ زمین پر پھینک کر پرچم تھامے وفد کی قیادت کرنے لگا۔ وہ "بڑا" لڑکا پاکستان کے ایک کروڑ پتی گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ ایک ایسا گھرانا جو اپنے ائیرکنڈیشنڈ بنگلوں اور لمبی امریکی کاروں میں بیٹھ کر دنیا بھر کے محنت کش عوام کے غم میں ہلکان ہوتا ہے۔

تقریب کے اختتام پر بین الاقوامی امن کی خواہش کے اظہار کے طور پر ساٹھ ہزار

کبوتر فضا میں چھوڑے گئے۔ ان رُوسی کبوتروں کی اکثریت اسیری کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ وہ سٹیڈیم سے باہر کی آزاد فضاؤں میں پرواز کر جانے کی بجائے واپس آ کر ہمارے کندھوں پر بیٹھنے لگے۔ ایک امریکی لڑکے نے ایک خوبصورت کبوتر کو دبوچ کر اپنے بیگ میں بند کر لیا۔

"سووینیر" اس نے مُسکرا کر میری جانب دیکھا۔

سٹیڈیم سے واپسی ہوئی تو میں بہت تھک چکا تھا۔ میں بہت چھوٹا تھا نا اس لئے۔

آج شب ماسکو کے سُرخ چوک میں میلے کی افتتاحی تقریب کی خوشی میں ایک عظیم جشن منایا جا رہا تھا۔ ایک ایسا جشن جس میں شمولیت کے لئے لازم تھا کہ ہر شخص اپنا چہرہ چھپا کر آئے۔ نقاب پوشوں کا جشن ..... ہمارے مترجم لیونا اور والنتینا بھی وہاں جا رہے تھے۔ اُدھر پاکستانی وفد میں شامل اکثر لڑکے دریائے ماسکو کے کنارے واقع سرسبز اور خوبصورت سیرگاہوں کی طرف جا چکے تھے۔ جہاں وہ غیر ملکی لڑکیوں کے ساتھ عالمی امن۔ بھائی چارے اور کچھ لو کچھ دو کے اصولوں پر بصیرت افروز گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

میں پہلے تو ہوٹل ذولوتوئی کولس کی پانچویں منزل پر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا سونے کی کوشش کرتا رہا ..... مگر آج تو جشن کی رات تھی ..... ماسکو کے آسمان پر پھٹتے ہوئے لاتعداد گولوں اور پٹاخوں کے دھماکوں نے مجھے سونے نہ دیا میرا نیم تاریک کمرہ آتشبازی کے مختلف رنگوں کی روشنی سے چمکتا رہا۔ سُرخ رنگ دوسرے تمام رنگوں پر غالب تھا ..... میرے کمرے کے عین نیچے سڑک پر ہزاروں غیر ملکی نوجوان ایک روسی موسیقار کا ترتیب دیا ہوا ترانہ "انٹرناشنال" چیخ چیخ کر گا رہے تھے۔ ہوٹل کی بار سے آج واڈکا شراب مفت مل رہی تھی۔

آخر کار میں بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ کوٹ کے کالر پر ایک ننھا سا پاکستانی پرچم سجایا اور سیڑھیاں اُتر کر سُرخ چوک کی جانب چل دیا۔



سُرخ چوک .... جس کے آخیر میں واقع کلیسائے سینٹ باسل کے پیاز نما گنبدوں کے عین وسط میں ابھی ابھی ایک گلرنگ انار چھوٹا تھا۔ سُرخ گنبد ایک لمحے کے لئے پیلے پڑ گئے تھے۔

سُرخ چوک .... جہاں ہجوم میں شامل تمام چہرے ساکن تھے۔ منجمد تاثرات کے پیکر ..... نقاب پوشوں کا جشن ..... آج جشن کی رات تھی۔

عظیم کراسنایا پلوشت .... جس کی وسعت انسانوں کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو اپنے اندر سمو لینے میں ناکام رہی تھی۔ ایسے انسان جنہوں نے آج کی شب .... اور صرف آج کی شب کے لئے اپنا بھیس بدل رکھا تھا .... اپنے چہرے چھپا رکھے تھے ....

اپنے آپ کو بدل لیا تھا۔ ہجوم میں شامل ہر فرد نقاب پہنے ہوئے تھا۔ جانوروں کے چہرے، عفریتوں کی شکلیں۔ جن۔ دیو۔ بھوت۔ چڑیلیں۔ کھوپڑیاں .... کاغذ اور گتے کے بنے ہوئے ان بے جان نقابوں کے پیچھے گوشت پوست کے زندہ

انسانی چہرے تھے جو صرف آج کی شب اپنا اصل روپ چھپا لینا چاہتے تھے۔

منجمد تاثرات کے ان پیکروں کی اکثریت رقص میں مشغول تھی۔ اکارڈین اور بانگو ڈرمز کی موسیقی نے پورے چوک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایک گروہ بلند آواز میں روسی گیت الاپ رہا تھا۔ دوسری جانب دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں لوک گیت گائے جا رہے تھے۔ چند طوطے ہجوم سے پرے دیوارِ کریملن کے سائے میں بیٹھے ٹیں ٹیں کرتے شراب پی رہے تھے۔

"ہو ہو"

ایک اُلو آنکھیں جھپکتا میرے قریب سے گزر گیا۔

"بُو"

ایک چڑیل نے میرے کان میں تان لگائی اور کھی کھی ہنستی ہوئی چلی گئی۔

"ہا۔ہا۔ہا"

ایک کنگ سائز بچہ ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھامے گھوم رہا تھا۔

"زدراست ویتے"

بھورے کوٹ میں ملبوس ایک ریچھ بھوں بھوں کرتا ہوا میرے پاس آیا اور روسی زبان میں "ہیلو" کہہ کر چلا گیا۔

"ہائے"

سنہری رنگ کا چُست سوئیٹر پہنے ایک عقاب نے امریکی لہجے کی انگریزی میں مجھے مخاطب کیا۔

"نمستے مہاراج"

ایک پستہ قد ہاتھی جھولتا ہوا میرے پاس سے گزر گیا۔

"وی سوشون"

سرخ اُبلتی ہوئی آنکھیں اور ایک لہراتی ہوئی لمبی دم۔ ایک اژدھے نے بڑے آرام سے اپنا تعارف چینی زبان میں کروایا۔ اور لہراتا ہوا آگے کھسکنے لگا۔

"بوانا سلام۔"

ایک کالا بھجوت بن مانس کسی افریقی زبان میں مجھے کچھ کہہ رہا تھا۔

"بانو میرا سنیور"

ایک کالا بُل ہسپانوی زبان میں پھنکارا اور سُرخ رنگ کی تلاش میں اِدھر اُدھر آنکھیں گھمانے لگا۔

"کٹ۔ کٹ۔ کٹ"

ایک آواز آئی جیسے کسی کے دانت سردی کی شدت سے بجنے لگے ہوں۔

میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا تو میرے سامنے ایک انسانی ڈھانچہ ہنہنا رہا تھا۔ "ہی۔ ہی۔ ہی۔"

میں خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

نقاب پوش نے انسانی ڈھانچے کا نقاب اُلٹ دیا۔ ڈھانچے کے پیچھے بھی کسی چہرے کی بجائے ایک دانت کٹکٹاتی کھوپڑی تھی۔ خوف کے مارے میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"ڈرو نہیں۔"

انسانی کھوپڑی نے میرے اور نزدیک آ کر کہا۔ "میں نے دوہرا نقاب پہن رکھا ہے۔ اگر صرف ایک ہی نقاب پہنا جائے تو کئی لوگ اُسے نوچ کر اُتار دیتے ہیں اور اس طرح تمہاری اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے۔"

"بے شک۔"

میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"آج تو جشن کی رات ہے۔" کھوپڑی نے خوشدلی سے کہا۔ "اور تم .... تم یہاں بے نقاب گھوم رہے ہو .... اپنی اصلی صورت لئے پھرتے ہو؟"

"ہاں! یہ یہاں اپنی اصلی صورت لئے پھرتا ہے ..... اصلی صورت!"

تاریکی میں سے ریچھ چیختا ہوا برآمد ہوا اور اس نے شور مچا دیا ..... عقاب بھی اس کے پہلو بہ پہلو چلا آ رہا تھا۔

"آج کی شب اس جشن میں شامل ہر فرد کو نقاب اوڑھنا پڑے گا۔ اپنا اصل چھپانا ہوگا۔"

عقاب کی تیز آواز میرے کانوں میں گھستی چلی گئی اور اس نے اپنے پنجے میرے کندھے میں گاڑھ دیئے۔

ہاتھی بھی اپنی سونڈھ ہلاتا جانے کہاں سے نمودار ہو گیا اور ریچھ اور عقاب کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

"ہاں مہاراج بھلا آج کی سندر شام بھلا کون مُورکھ اپنی صورت ..... اپنی اصلی صورت دکھاتا ہے .... مہاپاپ .... ہری اوم"

اتنی دیر میں لمبی دُم والا اژدھا بھی رینگتا ہوا آن پہنچا۔

"کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟"

اُس نے ہولے سے پوچھا۔

"یہ اپنی اصلی صورت لئے یہاں گھوم رہا ہے۔"

ریچھ دھاڑا۔

"بہروپ نہیں بھرتا۔"

عقاب غصے سے بولا۔

"پھر کیا ہوا؟" اژدھے نے فلسفیانہ انداز میں نرمی سے کہا۔ "اگر یہ اپنی اصلیت

برقرار رکھنا چاہتا ہے تو تم کیوں روکتے ہو؟

"ہم روکیں گے۔"

ریچھ نے برہم ہو کر کہا۔

"ہم ضرور روکیں گے۔"

عقاب نے چونچ ہلائی۔

"یہ حضرات سو فیصد درست کہتے ہیں۔ جشن کے اپنے قوانین ہیں اور اس میں شرکت کرنے والے ہر فرد کو ان پر عمل کرنا ہی ہو گا۔"

ہاتھی کان ہلا کر بناوٹ سے بولا۔

"لیکن ....." اژدھے نے احتجاج کے لئے منہ کھولا .... اس کے منہ میں دانت نہیں تھے۔

"تم کون ہو ہمارے معاملات میں دخل دینے والے۔"

ریچھ اور عقاب نے اژدھے کو جھاڑ پلائی اور وہ بڑی بیچارگی سے رینگتا ہوا ایک کونے میں جا بیٹھا "میرے دانت اُگ آنے دو۔ مجھے اپنی پرانی کینچلی پوری طرح اُتار لینے دو۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"آخر نقاب پہننے میں حرج ہی کیا ہے۔"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بن مانس اور بُل کھڑے التجا کر رہے تھے۔

"بڑے بھائیوں کی بات مان لینی چاہیئے۔ نہ مانو گے تو بھوکوں مرو گے۔"

"نہیں ...." میں نے تنک کر کہا۔ "نقاب پہننے سے مجھے اُلجھن ہوتی ہے۔ میں اپنا اصل ....."

"کیا ہے تمہارا اصل؟"

ریچھ نفرت سے چلایا۔

"کون سی ہے تمہاری اصلی صورت؟"

عقاب نے غصے میں اپنی چونچ کٹکٹائی۔

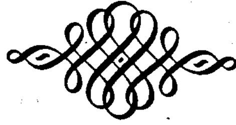
"ہم بھی تو دیکھیں آپ کا اصل؟"

ہاتھی اِٹھلا کر بولا۔

"تمہارا اصل .... اصلی صورت .... اصل .... اصل۔"

تینوں مل کر چیخنے لگے۔

"میرا اصل .... میری اصلی صورت۔" میری آنکھوں میں نمی کی ہلکی سی تہ بھیگ آئی اور ہر شے دھندلانے لگی .....



اکارڈین اور بانگو ڈرمز کی موسیقی مدھم پڑتی چلی گئی اور اس کی جگہ دور کہیں ڈھول کی تھاپ اور چمٹے کی مدھ بھری لے اُبھرنے لگی .... سُرخ چوک کے درمیان جلنے والا الاؤ تیز تر ہوتا چلا گیا .... الاؤ کی حدت سے جشن میں شامل تمام لوگوں کے چہروں سے نقاب خزاں رسیدہ پتوں کی مانند خود بخود جھڑنے لگے۔ اُن کا اصل روپ ظاہر ہو رہا تھا۔ ان کا بہروپ ..... ان کا سوانگ اب ختم ہو چکا تھا۔ اب ان کے ہاتھوں میں موم بتیاں تھیں۔ جنہیں وہ بڑے احترام اور پیار سے الاؤ میں ڈال رہے تھے۔ ہزاروں لاکھوں موم بتیاں اس الاؤ میں پگھل رہی تھیں۔ بھڑک کر راکھ ہو رہی تھیں۔ الاؤ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور اس کے جلنے سے ایک ایسی گمبھیر گڑگڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی جیسے کوئی عرشِ معلٰے کے تمام دروازے کھٹکھٹا رہا ہو۔ انہیں توڑ ڈالنے کی سعی کر رہا ہو

ے من تندور۔ آہیں دے لمبو   سیخ چڑھیدا میںڈا تن من بُجھدا

میرے گلے میں موتیے کا ہار ہے اور ہاتھوں میں ایک جھالر والا چمٹا جسے بجاتا

ہوا میں الاؤ کے گرد بے اختیار رقص کئے چلا جا رہا ہوں ۔

ے مادھو پیا میری جھولی بھر دے

الاؤ کی حدت میرے گالوں میں رچ بس کر پورے جسم میں آتشِ سیال کی مانند پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ میری آنکھیں سُرخ رہی ہیں۔ میرے پاؤں ڈھول سے اٹ گئے ہیں ..... آج مادھو لال حسین کا میلہ ہے۔ میلہ چراغاں .... میرا اصل ۔ میرے بالوں میں اور ماتھے پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے تیر رہے ہیں جو میری آنکھوں میں گرتے ہیں تو میں ایک انجانی لذت کے احساس سے سر جھٹک کر دیوانہ وار رقص کرنے لگتا ہوں۔ ہزاروں لوگ سر نیچا کئے شاہ حسین کے مزار کی سیڑھیاں چڑھ کر الاؤ کی جانب آ رہے ہیں اور پھر اپنی عقیدت کے اظہار کے طور اس میں موم بتیاں ڈال کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

مزار سے باہر سڑک کے کنارے کنارے سرکس کمپنیوں کے خیموں کے باہر مسخرے لوگوں کو ٹکٹ خریدنے پر اکسا رہے ہیں۔

تھیٹروں کے باہر بلند تھڑوں پر گراموفون ریکارڈوں کی تیز دھن پر ہیجڑے ناچ رہے ہیں۔

موت کا کنواں۔ چین کا جادوگر۔ قسمت کا حال۔ دو سروں والی لڑکی۔

سُرخ مسالے والے میدے کے قتلمے اور کباب۔

مٹی کے بنے ہوئے پکے برتن اور گھڑے .... اپنی سوہنیوں کے انتظار میں..

ایک طرف قوالی ہو رہی ہے۔ میں آگے بڑھتا ہوں ...... لوگ میرے لئے راستہ بناتے ہیں .... میں چمٹے کی لے پر جھومتا ہوا قوالوں کے سامنے بچھی سفید چادر پر رقص کرنے لگتا ہوں۔ مجھ پر وجد طاری ہے۔ سر جھٹکتا ہوں تو ہار میں پروئے موتیے کے پھول میرے گلے سے علیحدہ ہو کر میرے گالوں کو آ چھوتے ہیں۔ سفید۔ خوشبودار۔

نازک ..... میں صرف انہیں بار بار چھونے کی خاطر سر تیزی سے جھٹکنے لگتا ہوں ۔ سفید چادر پر میرے ڈھول سے اُٹے پاؤں کے نشان پڑتے چلے جاتے ہیں، ..... قوال بھی اپنی لے تیز تر کئے چلے جا رہے ہیں ۔

ماہئے نی کینوں آکھاں، درد وچھوڑے دا حال
دھواں دُھکھے میرے مرشد والا، جاں پھولاں تاں لال
سُولاں مار دیوانی کیتی، برھوں پیا ساڈے خیال
دُکھاں دی روٹی، سُولاں دا سالن، آہیں دا بالن بال
ماہئے نی کینوں آکھاں .....

"ہاں !" میں سر جھٹک کر بڑبڑاتا ہوں " ہمارے نصیبوں میں تو دکھوں کی روٹی اور کانٹوں کا سالن ہی ہے جسے ہم آہوں کی آگ جلا کر پکاتے ہیں ..... اپنے آپ کو نوچ نوچ کر ....."

آہیں دا بالن ..... بالن ...... بالن

قوال جیسے بالن کے لفظ پر آ کر اٹک گئے ہوں ۔ وہ بار بار یہی مصرعہ دہرا رہے ہیں ۔ میں بھی چمٹا سر سے اوپر دونوں ہاتھوں میں تھامے اٹک اٹک کر ناچ رہا ہوں ایک عقیدت مند ہجوم میں سے اُٹھ کر میرے پاؤں چھو لیتا ہے ۔ میرے پاؤں جو مادھو کی مٹی سے اُٹے ہیں ۔ میں نعرہ لگاتا ہوں ۔

مادھو پیا میری جھولی بھر دے

سامعین کے درمیان میں ایک بوڑھا کمر پر پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ لادے دیوانہ وار رقص کر رہا ہے ۔ اُسے اب اتنی ہوش نہیں کہ وہ لوگوں کو پانی پلا کر کچھ پیسے بنا لے ۔ وہ اب ان مادی خواہشات سے بے نیاز ہو چکا ہے ۔ جانے وہ کس طرح جان لیتا ہے کہ میرے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں ۔ پیاس سے میری زبان سوکھ رہی ہے

وہ اسی طرح مشکیزہ اُٹھائے گلاس ہاتھ میں تھامے میری جانب رقص کرتا ہوا چلا آتا ہے اور مجھے اپنے ہاتھوں سے پانی پلاتا ہے ..... میں سر اٹھا کر اُس کی جانب دیکھتا ہوں تو وہ مسکرا دیتا ہے "ایہو ای اصل اے" وہ بڑی عقیدت سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پنڈال سے باہر لے جاتا ہے ۔

مزار سے پرے ایک ٹنڈ منڈ درخت کے نیچے دس بارہ ملنگ سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں ۔ ایک کچا گھڑا اُن کے پاس دھرا ہے اور درمیان میں کسی تناور درخت کا تنا آہستہ آہستہ سلگ رہا ہے ۔ ہوا کا جھونکا آتا تو راکھ اُڑ کر ملنگوں کے چہروں اور داڑھیوں پر پھیل جاتی ۔

"ایہو ای اصل اے" بوڑھا میرے کان میں سرگوشی کرتا ہے اور پھر اسی طرح ناچتا ہوا واپس چلا جاتا ہے ۔

ملنگ میری جانب شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ ان کی آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں .....

"یا علی مدد" میں چمٹا اٹھا کر نعرہ لگاتا ہوں ۔

"مولا علی مدد" تمام ملنگ بیک وقت جواب دیتے ہیں ۔

اجنبیت ختم ہو جاتی ہے ۔ اب میں اُن میں سے ہوں ۔

میں اُن کے ساتھ زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوں ......

میلے کی تمام آوازوں سے بلند ڈھول کی "دھم دھم" اور چمٹے کی "آیوں آیوں" میرے کانوں میں مختلف سمتوں سے آ کر ٹکرا رہی ہے ۔ یہ موسیقی ہائی فائی کی مانند صرف چار سمتوں سے نہیں آ رہی بلکہ اس میں درجنوں سمتیں ہیں ۔ ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے پر بھی راکھ کی تہ جما دیتا ہے ۔ اجنبیت کا آخری پردہ بھی اُٹھ جاتا ہے ۔

"اتنی سردی تو نہیں پھر تم لوگوں نے آگ کیوں جلا رکھی ہے ؟" میں چمٹے سے

راکھ کریدتا ساتھ والے ملنگ سے پوچھتا ہوں۔

"آگ"، وہ گھٹنوں میں سے سر اُٹھا کر اپنی سُرخ آنکھیں مجھ پر جما دیتا ہے۔

"ایہہ تے سائیں دا مچ اے"!

میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی خاموش بیٹھا رہتا ہوں۔

وہ اپنے لمبے چوغے کی جیب میں سے ایک تُڑا مُڑا سگریٹ نکال کر سلگاتا ہے اور میری جانب بڑھا دیتا ہے۔ میں ایک گہرا کش لگاتا ہوں تو دم باہر کو آنے لگتا ہے۔ میں سگریٹ واپس کر دیتا ہوں۔

"بادُ بُوٹی پئیں گا؟" وہ آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لگا کر مجھ سے پوچھتا ہے۔

"بُوٹی؟" میں حیران ہو کر پوچھتا ہوں۔ "کیسی بوٹی؟"

"اوئے بوٹی نئیں جاندا؟" ایک نوجوان ملنگ اپنے میل سے اٹے ہوئے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پوچھتا ہے اور میرے ہاتھ سے چمٹا لے کر "مچ"، کے گرد رقص کرنے لگتا ہے ؎

دنیں گھوٹیاں۔ راتیں پیتیاں
لوکی کہندے ایہہ مر گئے
اساں مولا نال گلاں کیتیاں!

میرے ساتھ والا ملنگ اپنی انگلیوں سے جلتا ہوا سگریٹ مَسل کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور مچ کے قریب دھرے گھڑے میں سے ایک پیالہ بھر لاتا ہے۔

"نہیں"، میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

"پی جا میری جان تیرا اللہ نگہبان!" وہ نعرہ لگاتا ہے۔

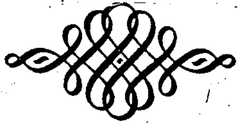
"نہیں"، میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔

"مادھو دے ناں دا پی جا" اس کی سُرخ آنکھیں غصّے سے اُبلنے لگتی ہیں۔

"نہیں"، میں چیخ کر کہتا ہوں "یہ فراریت ہے۔ یہ میرا اصل نہیں" ملنگ مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ "مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ تم ہم میں سے نہیں۔ بہروپئے ہو!" اور پھر ایک سانس میں پیالہ خالی کر کے "علی حیدر" کا نعرہ لگاتا ہے اور "مچ" کے گرد ناچنے لگتا ہے۔ میں وہاں سے ہٹ کر ایک مرتبہ پھر الاؤ کے پاس آ کھڑا ہوتا ہوں۔

الاؤ کے گرد کھڑے ہزاروں عقیدت مندوں کے چہرے روشنی سے دمک رہے ہیں۔ اُن کے اصلی چہرے وہ سب بے نقاب ہیں۔ یہاں کوئی بہروپ نہیں۔

میں جیب میں سے موم بتیوں کا آخری بنڈل نکال کر الاؤ کے بیچ میں پھینک دیتا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری موم بتیاں آگ میں پگھل نہیں رہیں۔ ... جیسے وہ پتھر کی ہوں اور پھر الاؤ مدھم پڑتا چلا گیا۔ چمٹے ڈھول اور ہارمونیم کی تانیں دور ہوتی گئیں۔ میرے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگوں کے چہرے دھندلانے لگے۔



پھر ہر شے بدل گئی - لوگوں کے ہیولے صاف دکھائی دینے لگے - لیکن اب اُن
سب نے نقاب پہن رکھے تھے ..... موسیقی کی تانیں بھی فضا میں اُبھر آئیں .....
اکارڈین اور بانگو ڈرمز کی موسیقی - میرے قدم لاہور میں مادھو لال حسین کے مزار
کی کچی مٹی کی بجائے ماسکو کے سُرخ چوک کے نوکیلے پتھروں پر جمے تھے - ریچھ
عقاب - بن مانس - بُل اور ہاتھی مجھے گھیرے ہوئے تھے -

"تمہارا اصل .... اصلی صورت .... اصل ..... اصل ؟"

وہ سب چیخ رہے تھے -

ریچھ نے آگے بڑھ کر مجھے کندھوں سے پکڑ کر زور زور سے ہلایا -

"تم بتاتے کیوں نہیں - یوں گم سُم کیوں کھڑے ہو ؟"

میں جیسے ایک خواب سے بیدار ہو جاتا ہوں -

"میرا اصل .... میری اصلی صورت .... ؟" میں بڑبڑاتا ہوں -

"مجھے خود بھی نہیں معلوم .... نہیں معلوم !"

وہ سب بے تحاشا ہنسنے لگتے ہیں -

"اچھا چلو یہ بتاؤ ...." ریچھ میرے کندھے پر تھپکی دے کر پوچھتا ہے -

"میرے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے ؟"

ے "اساں اندر باہر لال ہے — اساں مرشد نال پیار ہے"

میں اُسی نیم خوابیدہ کیفیت میں جواب دیتا ہوں -

"اور میرے بارے میں ...."

عقاب اپنے پَروں میں چونچ تیز کرتے ہوئے سوال کرتا ہے -

ے "اساں ٹکڑ منگ کھادنا — اساں ایہو گم کماونا"

یہ کہتے ہوئے میں اپنی نظریں نیچی کر لیتا ہوں -

"مہاراج کچھ ہمارے بارے میں بھی ہو جائے"

ہاتھی کھی کھی کر کے ہنستا ہوا پوچھتا ہے -

ے "سچی گل سینوں کیوں کر — پچی ہڈاں وچ رچی"

میں آرام سے کہتا ہوں -

اب کھوپڑی نے آگے بڑھ کر بتیسی کٹکٹائی -

"مجھے بھی کچھ بتاؤ گے ؟"

ے ماس جھڑے - جبڑ پنجر ہویا — کڑکن لگیاں ہڈیاں"

میں موت کے تصور سے خوفزدہ ہو جاتا ہوں -

اژدھا جو اس تمام ہنگامے سے دور ایک کونے میں اپنی پرانی کینچلی اُتارنے کی
کوشش میں محو تھا سر اُٹھا کر بولا -

"تم منافقت برت رہے ہو - ان لوگوں سے ڈرتے ہو ..... اپنے جذبات
کا اظہار نہیں کر پاتے - بس میں اپنی کینچلی اُتار لوں - اب چند دنوں کی بات ہے پھر

".... مجھ سے مت ڈرو۔ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ؟"

ے "کہے حسین فقیر سائیں دا   میں نا ہی سب توں!"

میں صدقِ دل سے اقرار کرتا ہوں۔

اژدھا اپنا پوپلا منہ کھول کر مسکرانے لگتا ہے۔

"پتہ نہیں کیا بک رہے ہو۔ یہ بولی ہماری سمجھ میں تو نہیں آتی"۔

ریچھ اور عقاب غصّے سے کہتے ہیں۔

"یہ میرا اصل ہے"

میں سنجیدگی سے جواب دیتا ہوں۔

"ہمیں تمہارا اصل بالکل پسند نہیں"

ریچھ اور عقاب چیخ کر اعلان کرتے ہیں اور آگے بڑھ کر مجھے دبوچ لیتے ہیں۔

"اِس کو ایسا رُوپ دے دو جو ہمیں پسند ہو"

وہ کھوپڑی کو حکم دیتے ہیں۔

کھوپڑی آگے بڑھتی ہے اور جیب سے ایک نقاب نکال کر زبردستی میرے چہرے پر جما کر سر کے پیچھے دھاگے کے دونوں سروں کو گرہ لگا دیتی ہے۔

"اب تم ایک انسان نہیں بلکہ ایک خرگوش ہو"

وہ سب مل کر نعرہ لگاتے ہیں اور قہقہے لگاتے ہوئے ادھر اُدھر ہجوم میں بکھر جاتے ہیں۔

اژدھا حسبِ سابق کونے میں بیٹھا اپنی کینچلی اُتارنے میں مصروف ہے۔ میں نے اپنے چہرے کے اُوپر چڑھے نقاب کو ہاتھ سے ٹٹولا۔ واقعی اب میں ایک خرگوش تھا۔ یہ لمبے لمبے کان۔ دو بڑے بڑے دانت اور مونچھیں۔ انگریزی کارٹون فلموں والا بگ بنی۔ اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں گاجریں کھاؤں۔ ٹائی کی گرہ درست کرنے لگا تو فوراً

یاد آیا کہ اب تو میں ایک خرگوش ہوں اور خرگوش ٹائی نہیں لگاتے۔ چنانچہ اس کی بجائے میں نے اپنے ڈھلکے ہوئے لمبے کان سیدھے کئے اور جشن میں حصہ لینے کے لئے ہجوم میں شامل ہوگیا۔ منجمد تاثرات کے پیکر میرے گرد گھوم رہے تھے اور میں بھی اب اُن میں سے ایک تھا۔

"نقاب فائدے کی چیز ہے" میں نے سوچا "انسان اندر سے چاہے کتنا ہی کریہہ اور بھیانک کیوں نہ ہو نقاب اُسے ایک ایسی شخصیت عطا کر دیتا ہے جو اس کا اصلی روپ دنیا سے چھپائے رکھتی ہے۔ مگر میرا تو ظاہر و باطن ایک تھا پھر بھی میں نقاب پہنے ہوئے تھا...... یہ میری کمزوری کی علامت تھا۔ زورآوروں کو اچھی طرح علم تھا کہ میرا تن تندور خالی ہے۔ اِسے بھرنے کے لئے مجھے اُن کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ میری اس مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر مجھے سوانگ بھرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اُن میں سے صرف اژدھے کو مجھ سے ہمدردی ہے مگر کون جانے پُرانی کینچلی اُتارنے کے بعد جب اُس کے دانت نکل آئیں تو وہ بھی ان جیسا ہی ہو جائے.... اور وہ ایسا ہو جائے گا۔

لینن کے مقبرے کے عین سامنے ایک گھوڑا جھوم جھوم کر اکارڈین بجا رہا تھا اور چند اونٹ ایک دائرے میں کوئی بے ہنگم سا رقص کر رہے تھے۔ میں بھی وہاں کھڑا ہو کر ان کی حرکات سے محظوظ ہونے لگا۔ دائرے کے درمیان میں ایک مگرمچھ بے تحاشا اٹھک بیٹھک کر رہا تھا۔ وہ کوسک رقص ناچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اونٹ ناچتا ہوا آگے بڑھا اور میرا لمبا کان پکڑ کر مجھے بھی دائرے کے اندر گھسیٹ لیا۔

"رقص"

اونٹ اپنی تھوتھنی آگے کر کے بلبلایا۔ اس کی تھوتھنی میں سے شراب کی

بو آ رہی تھی۔

"مجھے رقص کرنا نہیں آتا۔"

میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"تاہنت۔"

کسی نے روسی زبان میں مجھے ناچنے کا حکم دیا۔ آواز جانی پہچانی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ریچھ اونٹوں کے درمیان اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اونٹ سر جھکائے اس کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔

"تمہارے لمبے کان جڑ سے اکھیڑ دیئے جائیں گے۔ اگر ریچھ مہاراج کے حکم پر عمل نہ کیا۔ تا تھئی۔ تا تھئی!"

ہاتھی جو ریچھ کے سائے میں بیٹھا تھا جھوم کر کہنے لگا۔

"کم آن بے بی ڈانس!"

وہ کمبخت عقاب بھی کہیں سے برآمد ہو گیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اژدھا کہیں بھی نہ تھا۔

ریچھ اور عقاب کی دھمکیوں نے مجھے مرعوب کر لیا تھا۔۔۔ شاید میں بہت چھوٹا تھا اس لئے۔۔۔۔۔

"رقص کرو گے نا تو کھانے کو گاجریں ملیں گی۔"

کسی نے ہجوم میں سے آواز لگائی اور سب اُونٹ بے تحاشا ہنسنے لگے۔

میں نے مگرمچھ کی تقلید کرتے ہوئے اُٹھک بیٹھک شروع کر دی۔

"ہُو ہُو۔ ہا ہا۔ ہُو ہُو" بے جان چہرے شور مچانے لگے ——

"خرگوش۔ خرگوش۔"

"گاجروں کے لئے رقص کر رہے ہو۔ شرم نہیں آتی!"

اب اژدھا بھی اُدھر آ نکلا تھا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ مجھے بے حد خفت محسوس ہوئی اور ایک اونٹ کا کان پکڑ کر دائرے سے باہر نکل گیا۔

مجھے اب ہر لمحے یہی دھڑکا لگا تھا کہ وہ کمبخت ریچھ اور عقاب بمعہ اپنے "ہز ماسٹرز وائس" کے پھر کہیں سے نازل نہ ہو جائیں اور کوئی اور اُلٹی سیدھی فرمائش نہ کر بیٹھیں۔ چنانچہ میں چوک سے ہٹ کر لینن کے مقبرے کے پہلو میں دیوارِ کریملن کے سائے میں آ گیا۔ یہاں نسبتاً کم لوگ تھے۔ سرو کے درختوں کی قطاروں اور گھنی پھولدار جھاڑیوں کی وجہ سے یہاں خاصی تاریکی تھی۔ میں نے اپنے لمبے کانوں پر ہاتھ پھیرا اور جیب میں سے سگریٹ نکال کر سلگانے کو تھا کہ یاد آیا کہ میرے نقاب میں منہ کے سامنے آنکھوں کے آگے بنے ہوئے دو سوراخوں کی طرح کوئی سوراخ نہ تھا۔ یعنی صرف دیکھ سکتے ہو۔ کھانے پینے پر پابندی ہے۔ میں نے سگریٹ واپس جیب میں رکھ لئے اور دیوارِ کریملن کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں بھی ماحول خاصا پُراسرار تھا۔ میرے ذہن میں لینن اور سٹالن کے لاشے اُبھرنے لگے۔۔۔۔

وہ میرے ساتھ ہی اس سُرخ سنگِ مرمر کے بڑے ڈبے کے اندر ایک تہ خانے میں شیشے کے صندوقوں میں بند لیٹے تھے۔

ماسکو میں میری پہلی مصروفیت اِن روسی رہنماؤں کی حنوط شدہ لاشیں دیکھنا تھی۔ زائرین کی قطار مقبرے کے دروازے سے شروع ہو کر سرخ چوک سے باہر گورکی سٹریٹ تک چلی گئی تھی۔ میں بھی ہزاروں روسیوں کے ہمراہ پوری دوپہر اس طویل قطار میں رینگتا رہا۔ صاف شفاف تہ خانے کے درمیان شیشے کے دو صندوقوں میں لینن اور سٹالن لیٹے ہوئے تھے۔ فوجی وردی میں ملبوس سٹالن کی بڑی بڑی مونچھیں ابھی تک اکڑی ہوئی تھیں۔ اس کے وجیہہ خدوخال پر

زردی چھائی ہوئی تھی جیسے موم کا بنا ہو.... موم کا سپاہی اور لینن .... اپنے روائتی لباس کوٹ ۔ واسکٹ اور چوڑی ٹائی میں ملبوس ۔ ٹائی کی یہی موٹی اور بھدّی گرہ جو اب تک لاکھوں تصاویر اور مجسموں میں امتیازی طور پر اُبھری ہے ۔ کشادہ پیشانی اور بال سلیقے سے جمے ہوئے ۔ دونوں رہنماؤں کا چھاتی سے نیچے کا دھڑ کمبل سے ڈھکا ہوا تھا .... لینن جس کا اشتراکی نظام آج دنیا کے نصف سے زیادہ حصّے پر محیط ہے .... لینن جس نے تاریخ میں پہلی مرتبہ مزدور اور کسان کو راج سنگھاسن کا صحیح حقدار قرار دیا ۔ مقبرے میں داخل ہوتے ہی ہر رُوسی کی نظر صندوقوں میں بندان حنوط شدہ لاشوں پر لگ جاتی ۔ وہ نہایت احترام اور عقیدت سے سر جھکائے خاموشی سے گزرتے رہتے ۔ میں نے دیکھا کئی آنکھیں پرنم تھیں ۔

یہاں درجنوں قوموں کے نمائندے تھے جو ثقافتی اور لسانی اعتبار سے ایک دوسرے سے کوسوں دُور تھے مگر وہ ایک ہی سیاسی نظام کے تحت ترقی کی جانب رواں دواں تھے ۔ یوکرینین ، سائبرین ، کاکیشین ، ازبک ، تاجک ، کاسک .... اور ان سب کے درمیان ایک نوعمر پاکستانی جو ابھی تک اپنے نظام کا تعین نہ کر سکا تھا.... کچھ لوگ مقبرے کے محافظ سے چوری چھپے صندوق کو جلدی سے چھو لیتے ۔ جیسے ہمارے ہاں قوال لہک لہک کر ے

تیری خیر ہووے پہرے دارا　　روضے دی جالی چم لین دے

الاپتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے اسی طرح رُوسی بھی لینن کا صندوق چھو لینے کی خواہش کا اظہار لوک گیتوں میں کرتے ہوں ۔ تہ خانے میں موت کی سی خاموشی تھی ماسوائے گزرتے ہوئے زائرین کے پاؤں کی ہلکی ہلکی چاپ کے ۔ محافظ دبے لفظوں میں ہر زائر کو خاموشی سے آگے بڑھتے جانے کی تلقین کرتے تاکہ گورکی سٹریٹ تک پہنچی ہوئی طویل قطار کے آخر میں کھڑا شخص بھی مقبرہ بند ہونے سے پیشتر اپنے محبوب

رہنماؤں کا دیدار کر سکے ۔

انہی دنوں کسی غیر ملکی اخباری نمائندے نے خروشچوف سے دریافت کیا تھا کہ لینن اور سٹالن کی لاشوں کو اُن کی موت کے اتنا عرصہ بعد تک کیسے محفوظ رکھا گیا ہے ۔ اس پر خروشچوف نے اپنی روائتی خوش دلی بروئے کار لاتے ہوئے جواب دیا تھا " ہر دو ماہ بعد ہم اِن بڈھوں کو صندوقوں سے نکال کر ان کے جسم کے اندرونی حصّوں کی خوب صفائی کرتے ہیں اور ان میں کیمیائی اجزا بھر دیتے ہیں "

بعد میں جب سٹالن کی تاریخی اہمیت ختم کرنے کی مہم چلی تو خروشچیف نے شاید اسی دو ماہی صفائی کے دوران میں حضرتِ سٹالن کا صفایا کر دیا ۔ اُس کی لاش کو نذرِ آتش کرکے راکھ دیوارِ کریملن کے سائے میں دبا دی گئی.... لیکن یہ نوبت بعد کی بات تھی ۔ آج سٹالن ہمیشہ کی طرح لینن کے پہلو بہ پہلو سو رہا تھا ۔ .... لیکن آج اتنا بڑا ہجوم ان عظیم رہنماؤں کی موجودگی سے بے نیاز صرف رقص کرنے اور شور و غل مچانے میں مصروف تھا .... آج جشن کی رات تھی اور جشن کی رات مرے ہوؤں کی یاد نہیں کیا کرتے ۔

ایک اور گلرنگ انار کریملن کی دیوار کے عین اوپر چھوٹ کر فضا میں رنگ ہی رنگ بکھیرتا منتشر ہونے لگا ۔ کلیسائے باگوو شنکی اور کلیسائے اُسپنکی کے سنہری گنبد تاریکی میں چمکنے لگے ۔ رنگ برنگے ماہتابوں کی مانند ، سُرخ ، نیلے ، زرد ، پیلے اور پھر بالآخر سیاہ ۔ انہی کلیساؤں کے تہ خانوں میں آج صبح میں نے کریملن کی سیر کے دوران میں لاتعداد راہبوں کے تابوت دیکھے تھے ۔ وہ کرسی جس پر بیٹھ کر زارِ روس کا پادری وعظ کیا کرتا تھا ۔ زارِ روس کا تاج اور قیمتی جواہرات کریملن .... جس کی چار دیواری پر بیس مینار شطرنج کے مہروں کی مانند جمے بیٹھے ہیں .... اور پھر کل شب اسی کریملن کے پرشکوہ دعوتی ہال کی وہ تقریب جہاں میرے علاوہ سینکڑوں

غیر ملکی نوجوانوں کو ایک پُر تکلف عصرانے پر مدعو کیا گیا۔ خروشچیف کی شخصیت حیرت انگیز طور پر مسحور کُن تھی۔ دعوت کے اختتام پر اس نے روسی زبان میں ایک جوشیلی تقریر کی۔ ہم سب نے "میری او دُرو زبا" کا نعرۂ امن بلند کیا۔ بلگانن اپنی کوچی داڑھی لئے ایک کونے میں دُبکا کھڑا تھا۔

ایک دم مقبرے کے دو مسلح محافظ مارچ کرتے ہوئے تاریکی میں سے نمودار ہوئے اور عین جس جگہ میں کھڑا تھا ساکت ہو کر منجمد ہو گئے۔

"ٹن ٹن"، کریملن کی چار دیواری کے کونے پر کھڑے سپالسکایا مینار پر نصب گھڑیال نے دو بجائے۔ مینار کی چوٹی پر اٹکا ہُوا سُرخ ستارہ پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

"اب ہوٹل واپس چلا جائے"۔ میں نے اپنے کان سیدھے کئے اور مونچھیں مروڑتے ہوئے سوچا۔ "صبح ایک اجتماعی فارم بھی تو دیکھنے جانا ہے"۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ اس راستے کی جانب ہو لیا جو سُرخ چوک سے باہر جاتا تھا۔ اس راستے کو "کریملن پیسیج" کہا جاتا ہے۔ یہاں مکمل تاریکی تھی اور میں نقاب میں بنے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں سے ٹھیک طرح دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ چلتے چلتے میرا پاؤں کسی سخت شئے سے ٹکرایا۔ میں نے جھک کر دیکھا..... قبر تھی سُرخ انقلاب میں شہید ہونے والوں کی مشترکہ قبر.....

کریملن کی دیوار کے سائے میں گھاس پر ایک غیر ملکی جوڑا بوس و کنار میں محو تھا۔ میں اُن کی عالمی امن اور بھائی چارے کی جذباتی کوششوں میں مخل ہوئے بغیر آگے بڑھ گیا۔

سُرخ چوک میں اب بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے..... ایک کونے میں ایک بندر جھوم جھوم کر اکارڈین بجا رہا تھا۔ مگر اس کی لے پر ناچنے والا کوئی نہ تھا۔ چوک کے بیچوں بیچ جلنے والا عظیم الاؤ بھی اب سرد پڑ چکا تھا اور اس کی راکھ کھردرے پتھروں پر پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ آتش بازی کا ذخیرہ بھی شاید ختم ہو چکا تھا۔ میں نے سرخ چوک اور

سپالسکایا مینار کے سُرخ ستارے پر ایک آخری نظر ڈالی اور روسی عوام کے تاریخی عجائب گھر کے ساتھ نکلتے ہوئے راستے سے باہر گورکی سٹریٹ پر آ نکلا۔

گورکی سٹریٹ سنسان پڑی تھی اور اس کے دو رویہ کھڑے درختوں کی قطاریں رات کے اس پہر بے حد بھیانک لگ رہی تھیں۔ دُور دور تک انسان یا کوئی نقاب پوش انسان صورت جانور بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"زیرِ زمین ریلوے کی آخری گاڑی تو کب کی روانہ ہو چکی ہوگی"۔

میں نے سوچا اور ہوٹل کی جانب پیدل ہی چل دیا۔ ماسکو میں جہاں روسی عوام کی مہمان نوازی اور خوش خلقی نے میرا دل موہ لیا۔ وہاں عظیم الشان زیرِ زمین ریلوے سٹیشنوں نے مجھے مبہوت کر کے رکھ دیا تھا۔ انہیں صرف سٹیشن کہہ دینا تو زیادتی ہوگی۔ عالی شان محلات تھے۔ قیمتی فانوس، سنگِ مرمر کے مجسمے، چمکتے دمکتے فرش، سنہری ستون، بیل بوٹوں سے مزین روپہلی چھتیں..... بس "عالم پناہ تشریف لاتے ہیں"۔ کی کسر تھی۔ ان نادر فن پاروں میں کالی کلوٹی گاڑی کو دیکھ کر بے حد دکھ ہوتا۔ ایک اور قباحت بھی تھی۔ سٹیشنوں کے نام اتنے طویل اور پیچیدہ تھے کہ "الیکٹروزاوڈسکایا" کہتے کہتے آدمی کا سانس بھی پھولنے کو آتا اور گاڑی الگ چھوٹ جاتی۔

میں اس سے پیشتر کئی مرتبہ سُرخ چوک سے اپنے ہوٹل تک پیدل جا چکا تھا۔ مگر رات کے اس پہر خاموش عمارتیں اور ویران سڑکیں غیر مانوس سی لگ رہی تھیں۔ بہر حال مجھے یقین تھا کہ اگر میں ناک کی سیدھ میں چلتا جاؤں تو بآسانی ہوٹل تک پہنچ جاؤں گا۔ میلے کی افتتاحی تقریب اور اس کے بعد سُرخ چوک کے ہنگامہ خیز جشن میں شمولیت نے مجھے بے حد تھکا دیا تھا اور میں جلد از جلد ہوٹل پہنچ کر آرام سے سو جانا چاہتا تھا۔ میں نے رفتار قدرے تیز کر دی۔

یکدم مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے..... رات کے سناٹے میں

.... قدموں کی چاپ .... میں کھڑا ہو گیا۔ خرگوش کے لمبے کان ڈھلکے ہوئے تھے۔ مگر میرے کان آواز پر لگے .... خاموشی! مکمل خاموشی .... کچھ بھی نہ تھا۔

"تیرے کان بج رہے ہیں"۔ میں نے خرگوش کے کان پکڑ کر زور سے کھینچے "اُس خرگوش ہونا! ڈرپوک کہیں کے" اور پھر چلنا شروع کر دیا۔

روس کا موسم ہمیشہ سے تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ماضی میں روسی سپاہ کی بے جگری کے پہلو بہ پہلو روسی موسمِ سرما بھی ملک کی سالمیت کا محافظ رہا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ البتہ موسمِ گرما کا معاملہ الگ ہے۔ آج دن کے وقت اتنی شدید گرمی پڑی کہ میرے ہوٹل میں قیام پذیر ایک ڈینش لڑکے کو سَن سٹروک ہو گیا۔ رات کے بارہ بجے تک موسم خوشگوار رہتا اور اس کے بعد بتدریج خنکی بڑھتی چلی جاتی۔ اس وقت بھی ہوا میں خنکی کا پہلو نمایاں تھا۔ لیکن صرف جسم کو ٹھنڈک کا احساس دلانے کی حد تک .... اس میں کاٹ نہ تھی۔ میں دونوں ہاتھ جیب میں ڈالے چلا جا رہا تھا۔ نپولین اور ہٹلر تو احمق تھے جو بھرپور سردیوں میں ماسکو یاترا کے لئے چل کھڑے ہوئے ...... اس لحاظ سے میں خوش قسمت تھا آج کل گرمیاں تھیں .... لیکن پھر روسی عوام کو اپنے دوست اور دشمن کی بھی تو پہچان ہے۔ میں اگر سردیوں میں بھی ماسکو آتا تو مجھے خوش آمدید کہا جاتا۔ سنا ہے کرسمس کی برفباری کے بعد سُرخ چوک کے گنبد اور کریملن کے مینار سنو وہائٹ کے طلسمی قلعے کا روپ دھار لیتے ہیں۔

میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ ایک مرتبہ پھر قدموں کی مدھم آواز رات کے سناٹے میں گونج گئی۔

ہلکے ہلکے نازک سے قدم.... ٹک ٹک ٹک!

میں فوراً رُک گیا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد پیچھے مُڑ کر دیکھا۔

خاموشی! مکمل سکوت .... کوئی بھی نہ تھا!

میں اب تیز تیز چلنے لگا.... خوف تو نہیں البتہ میں بے چینی سی ضرور محسوس کر رہا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا شاید بائیں ہاتھ پر یہ وہی گلی تھی جہاں ازبکستان کی نامور فنکارہ تمارا خانم رہتی تھی.... فلیٹ نمبر ۱۶-۷-۴۶ پرسوں شب اُس نے پاکستانی وفد کے اعزاز میں اپنے فلیٹ میں ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ ازبک پلاؤ، نان، تکے کباب اور اس کے بعد ازبک رقص اور لوک گیت.... اگر میں اس وقت تمارا خانم کے فلیٹ کا دروازہ جا کھٹکھٹاؤں تو؟ لیکن کہوں گا کیا؟ .... یہی کہ میں خوفزدہ ہوں۔ میرے کان بج رہے ہیں:.... کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ واہ! خوب نیک نامی کرو گے اپنے ملک کی اور پھر رات کے اس پہر۔

"یہ سب تمہارے واہمے ہیں"۔ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی اور بدستور چلتا رہا۔

میں اب سٹیٹ بالشوئی تھیٹر کے سامنے واقع سوردلوا چوک میں پہنچ چکا تھا... بالشوئی تھیٹر جہاں چند روز پیشتر میں نے روس کی مایۂ ناز بیلے رینا گالینا اولانووا کو "رومیو اور جیولیٹ" کے بیلے رقص میں دیکھا تھا۔ عمر رسیدہ اولانووا ایک خوشنما تتلی کی مانند ہوا میں تیرتی پھرتی تھی.... تھیٹر کے کورنتھین طرز کے ستون اس وقت بہت بلند معلوم ہو رہے تھے.... چوک کے درمیان والا فوارہ بند پڑا تھا۔ میں نے فوارے کے تالاب میں سے پانی لے کر منہ پر چھینٹے مارے اور پھر ترگنوف چوک کی جانب چل دیا۔ وہاں سے میرا ہوٹل نزدیک ہی تھا۔

ایک جانی پہچانی آواز پھر میرے کانوں سے آٹکرائی .... قدموں کی چاپ .... بہت سارے قدم۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ میرے کان وغیرہ نہیں بج رہے بلکہ سچ مچ کوئی میرا پیچھا

کر رہا ہے۔ میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی ۔۔۔۔
سرسراہٹ سی ہوئی اور اسی لحظہ قدم بھی رُک گئے۔ میں نے پھر چلنا شروع کر دیا
قدموں کی آواز پھر فضا میں اُبھر آئی۔ میرے ذہن میں خفیہ پولیس کے موٹے اور گنجے
ایجنٹ ناچنے لگے اور ماسکو کی خنک شب میں لاہور کی تپتی دوپہر میں پھوٹنے والے
پسینے کی نمی شامل ہو گئی۔

قدموں کی آواز برابر آ رہی تھی۔ نپے تلے جانچے ہوئے نازک قدموں کی چاپ
۔۔۔۔ میں جان بوجھ کر آہستہ چلتا تو میرا پیچھا کرنے والے قدم بھی سُست پڑ جاتے
اور تیز چلنے سے ان کی رفتار میں بھی فوراً اضافہ ہو جاتا۔

ے مادھو پیا میری جھولی بھر دے

میں نے گنگنانے کی ناکام کوشش کی اپنے خوف کو دبانے کی غرض سے سیٹی
بجانے کے لئے لب سکیڑے تو اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ پتلون کی جیبوں میں میری
ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔ اس چاپ سے کوئی مفر نہ تھا۔ تمام گلیاں
اور بازار سنسان پڑے تھے ۔۔۔۔ کوئی بھی نہ تھا ۔۔۔۔ صرف آوازیں ۔۔۔۔ قدموں کی!
اگرچہ ہوٹل پہنچنے کے لئے مجھے بالکل سیدھا جانا تھا مگر میں ایک دم دزجن سٹریٹ
میں مڑا اور پھر کونے میں ایک بند دکان کے برآمدے کے ستون کے پیچھے چھپ کر
کھڑا ہو گیا۔

قدموں کی آواز فوراً تیز ہو گئی جیسے انہیں خدشہ ہو کہ میں اُن سے فرار ہو
جاؤں گا۔ موڑ پر پہنچ کر قدم قدرے ٹھٹکے اور پھر ۔۔۔۔ میں پھرتی سے ستون کے پیچھے
سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔

نیلے رنگ کا چست سویٹر پہنے۔ عقاب!

بھورے کوٹ والا۔ ریچھ!

اور سفید لباس میں ملبوس ایک فاختہ!

مگر اب میں ریچھ اور عقاب سے قطعاً خائف نہ تھا ۔۔۔۔ بہت ہو چکی ۔۔۔۔
اب اگر انہوں نے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کی تو میں ان کے نقاب نوچ
پھینکوں گا اور ان کی اصلیت ظاہر کر دوں گا ۔۔۔۔ لیکن یہ فاختہ کہاں سے آ گئی۔
ان کا آپس میں کیا جوڑ!

میں نے پہلی مرتبہ غور سے ان کے جسمانی خدوخال کا جائزہ لیا۔

تینوں نقاب پوش ۔۔۔۔ لڑکیاں تھیں!

ان تینوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے اور اُن کی انگلیاں آپس
میں زنجیروں کی مانند جکڑی ہوئی تھیں ۔۔۔۔ جیسے وہ ایک دوسرے کے سہارے کے
بغیر چل نہ سکتی ہوں ۔۔۔۔ فاختہ درمیان میں تھی۔ وہ تینوں میرے قریب آ گئیں۔

ریچھ نے اپنی تھوتھنی آگے کر کے میرے کوٹ کے کالر پہ لگا پاکستانی پرچم دیکھا
اور سر جھکا کر کہنے لگا۔

"نمستے!"

یہ کہتے ہوئے اس نے روائتی انداز میں ہاتھ نہیں جوڑے ۔۔۔۔ اس کے ایک
ہاتھ کی انگلیاں فاختہ کی انگلیوں میں سختی سے گتھی ہوئی تھیں ۔۔۔۔ میں خاموش رہا
۔۔۔۔ ماسکو میں اکثر لوگ مجھے ہندوستانی جان کر "نمستے" کہہ دیا کرتے تھے۔

"کیا تم ماسکو میں اجنبی ہو؟"

عقاب نے چونچ ہلا کر دریافت کیا۔

"آخر آپ میرا پیچھا کیوں کر رہی ہیں؟" میں نے عقاب کا سوال نظر انداز کرتے
ہوئے ترشی سے کہا۔ "سُرخ چوک کے جشن کے دوران میں آپ دونوں نے جس طرح
مجھے زچ کیا تھا کیا اُس کے بعد کوئی اور کسر بھی باقی ہے؟"

نقابوں کے پیچھے روپوش ہونٹوں میں شاید جنبش ہوئی ہوگی۔ ان کی ہلکی ہلکی ہنسی کی آواز مجھ تک آ رہی تھی۔

کاش میرے پاس بھی کسی خونخوار جانور کا نقاب ہوتا پھر نپٹتا ان سے۔ اب خرگوش جان کر خواہ مخواہ تنگ کر رہی ہیں۔ میں نے منہ بنا لیا اور واپس مڑ کر چلنا شروع کر دیا۔

قدموں کی چاپ پھر سے شروع ہو گئی۔

وہ بدستور میرے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔

میں جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا "آخر آپ لوگ چاہتی کیا ہیں؟"

تینوں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کچھ بھی تو نہیں"

عقاب نے ملائمت سے کہا۔

"کچھ بھی تو نہیں!"

ریچھ تھوتھنی لٹکا کر بولا۔

فاختہ خاموش رہی۔

میں اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا "تو پھر؟"

"دراصل" ریچھ بالآخر اپنی لمبی تھوتھنی اٹھا کر ملائمت سے کہنے لگا "ہمیں غیر ملکی نوجوانوں سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ اسی لئے ہم سرخ چوک میں تمام عرصہ صرف آپ کو دیکھتی رہی ہیں ...."

"صرف دیکھتی رہی ہیں" میں پھٹ پڑا "بہت خوب! اور یہ جو مجھے خرگوش بننے پر مجبور کیا گیا ہے وہ کس کی کارستانی ہے؟ .... تا ہنت۔ کم آن بے بی ڈانس .... اُن اونٹوں کے درمیان میں مجھے دھمکیاں دے کر رقص کروایا گیا .... اور پھر

آپ کا وہ وفادار چچہاتی .... جس نے صرف آپ دونوں کی شہ پر میری زندگی حرام کر دی .... صرف دیکھتی رہی ہیں۔ ہونہہ!"

ایک مرتبہ پھر دبی دبی ہنسی کی آواز نقابوں کے پیچھے سے برآمد ہوئی۔

"جشن کی رات تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے"

عقاب نے چونچ کھولی۔

"مادھو لال حسین کے میلے میں تو ایسا نہیں ہوتا"

میں نے تنک کر کہا۔

"مادھو...." انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا "کیا وہاں اس جشن میں تمام لوگ نقاب پہن کر نہیں جاتے؟"

"نہیں" میں نے سینہ پھلا کر کہا "ہمیں اپنے اصل سے پیار ہے"

"تو پھر وہ جشن کیا ہوا جس میں آدمی اپنی اصلیت برقرار رکھے"

ریچھ اور عقاب سر ہلا کر بولے۔

میں نے جواب دینا مناسب نہ جانا۔

قدرے توقف کے بعد ریچھ گویا ہوا۔

"یقین جانیئے ہمارا مقصد آپ کی دل آزاری نہ تھا۔ اگر آپ نے ہماری ان حرکات کا بُرا مانا ہے تو ہم معذرت خواہ ہیں .... کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل معذرت خواہ ہیں"

عقاب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"ویسے اگر آدمی جشن میں شامل ہو تو تھوڑی بہت سپورٹس مین سپرٹ تو ہونی چاہیئے"

"نہیں ہے مجھ میں سپورٹس مین سپرٹ" میں بھڑک اُٹھا۔

"آپ لوگ ہمیشہ اس قسم کی سپرٹ کی سرشاری کے لئے خرگوش جیسے شریف جانور کا انتخاب کیوں کرتے ہیں؟ کبھی تو طاقتور ریچھ اور عقاب کو اس سلسلے میں موردِ الزام ٹھہرایئے۔"

"آپ تو واقعی ناراض ہو گئے ہیں۔"

ریچھ کی تھوتھنی لٹک گئی۔

"ہاں! ہاں! ناراض ہو گئے ہیں۔"

عقاب کی چونچ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی۔

فاختہ کچھ نہ بولی۔

"ہی ہی ہی" ایک خوفناک قہقہہ پاسکو کی خاموش رات میں گونج گیا۔ نقاب پوش لڑکیوں کے عقب میں کچھ فاصلے پر کھوپڑی ایک تاریک کونے میں سے جھانک رہی تھی۔ وہ ایک کالے چغے میں ملبوس تھی جس پر انسانی جسم کے ڈھانچے کی لکیریں کسی ایسے کیمیائی مرکب سے بنی تھیں۔ جو اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا... ہڈیوں کی فاسفورس۔ موت ہمارے تعاقب میں تھی۔ خوف کی ٹھنڈی سِل نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"ہماری سہیلی ہے۔" ریچھ ہنس دیا۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے لوگوں کو ڈرانے کا بڑا شوق ہے۔"

"ہاں! ہماری سہیلی ہے۔ شریر کہیں کی!"

عقاب نے پیار سے کہا۔

فاختہ حسبِ عادت خاموش کھڑی رہی۔

"خدا حافظ!"

میں نے منہ پھیر کر چلنا شروع کر دیا۔

قدموں کی چاپ! دبی دبی ہنسی!

وہ بدستور میرے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔

میں جھنجلا گیا۔

"اب اگر آپ میرے پیچھے آئیں تو میں تمہاری تھوتھنی ..... اور جناب کی چونچ توڑ کر رکھ دوں گا..... خرگوش ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ مجھ میں عزتِ نفس قسم کی کوئی شے نہیں۔" میں نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں...." ریچھ اور عقاب ایک ساتھ بول اٹھے۔ "دیکھئے ہم وعدہ کرتی ہیں کہ اب آپ کو تنگ نہیں کریں گی.... صرف...."

"صرف؟"

"صرف.... اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ہم تینوں آپ کے ساتھ ساتھ چلی آئیں؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

میں نے ناگواری سے جواب دیا اور پھر چلنے لگا۔

"بہت بہت شکریہ"

ریچھ حقیقتاً شکر گزار نظر آ رہا تھا۔

"بہت بہت شکریہ۔"

عقاب کہہ رہا تھا۔

فاختہ کچھ نہ بولی۔

اور پھر تینوں میرے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ انہوں نے حسبِ سابق ایک دوسرے کے ہاتھ سختی سے تھام رکھے تھے۔

ریچھ اور عقاب نے مجھ سے لاتعداد سوال پوچھ ڈالے۔

کیا اب بھی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں؟

کیا مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ نہیں ؟

لینن کی قومیتوں کے بارے میں تقریر کے سلسلے میں تمہارا کیا نکتہ نظر ہے ؟

پاکستان میں ایسے گھرانے ہیں جہاں ٹی۔ وی اور فرج نہیں ؟

لندن میں تم نے کارل مارکس کی قبر دیکھی ہے ؟

فاختہ نے چونچ تک نہ ہلائی ۔ خاموش !

میرا مُوڈ اب قدرے بہتر ہو چکا تھا اور میں بڑی آسانی سے باتیں کئے چلا جا رہا تھا۔ ریچھ اور عقاب کی خونخواری سے بھی اب میں ذرّہ بھر خائف نہ تھا۔ لاہور کی تپتی دوپہریں ایک خواب تھیں۔ میں صرف ماسکو کی خوشگوار رات میں سانس لے رہا تھا۔

ماسکو.... جس کی سیاہ رات میں ایک ریچھ، ایک عقاب اور ایک خرگوش آپس میں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے....

"خرگوش !"

کسی نے زور سے پکارا اور پھر ایک خوفناک قہقہہ بلند ہوا۔ یہ کھوپڑی تھی۔ "ہماری سہیلی" ریچھ اور عقاب نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ "شریر کہیں کی۔" فاختہ خاموش رہی۔

میں نے اپنے نقاب کے سوراخوں میں سے انہیں غور سے دیکھنے کی کوشش کی..... ریچھ اپنے بھورے کوٹ میں قدرے فربہ نظر آ رہا تھا۔

عقاب لمبے قد کا تھا اور چست سویٹر میں سے اُس کے جسمانی اُبھار بے حد نمایاں نظر آ رہے تھے۔

اور فاختہ ! درمیانے قد کی۔ دھان پان سی۔

"اِن نقابوں کے پیچھے تین خوبصورت لڑکیوں کے چہرے ہونے چاہئیں۔"

میں نے اُن کے متناسب جسمانی خدوخال سے اندازہ لگایا۔

"کیا تم روسی زبان جانتے ہو؟"

ریچھ کو جانے کیا خیال آیا۔

"ماہلنکی !"

میں نے اٹک کر جواب دیا۔

"خراشو ! خراشو !"

دونوں بے تحاشا ہنسنے لگیں۔

"کیا میں نے غلط کہا ہے ؟" میں نے تنک کر کہا۔ "اس کا مطلب" تھوڑی تھوڑی "نہیں ہے کیا ؟"

"تم نے بالکل درست جواب دیا ہے" ریچھ کی ہنسی تھمنے میں نہ آ رہی تھی۔

"مگر تمہارا لہجہ عجیب سا ہے۔"

"ماسکو آنے سے قبل میں نے غیر ملکی زبانوں کے ایک سکول میں روسی زبان کا چھ ہفتوں کا ایک کریش کورس مکمل کیا تھا۔" میں نے نقاب کے اندر ناک چڑھائی "اور یہاں آئے ہوئے مجھے ابھی چند روز ہوئے ہیں۔ اتنے مختصر عرصے میں میں اہلِ زبان کی مانند گفتگو کرنے سے تو رہا۔"

"اچھا تو پھر یہ بتاؤ۔ کاٹوری چہاس ؟"

عقاب نے مٹک کر پوچھا۔

"کیا مطلب ؟"

میرے نے کچھ پلے نہ پڑا کہ وہ کیا پوچھ رہا ہے۔

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ تم روسی زبان جانتے ہو۔"

"اتنی بھی نہیں جانتا کہ یہ کاٹوری وغیرہ سمجھ میں آ جائیں۔"

کاٹودی چہاس کا مطلب ہے "کیا وقت ہوا ہے؟"

ریچھ نے راہنمائی کی۔

"وقت؟" میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ تین بج کر دس منٹ ہونے کو تھے۔

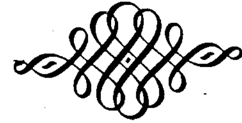
ذہن میں روسی زبان کی گنتی دہرائی اور پھر اٹک اٹک کر جواب دیا "ڈسا پت منیوت۔ چیٹ وی تروا"

"خراشو۔ خراشو"

انہوں نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔ اگر اُن کی انگلیاں ایک دوسرے میں یوں اُلجھی نہ ہوتیں تو وہ ضرور تالی پیٹ دیتیں۔

"بھلا گاجر کو روسی زبان میں کیا کہتے ہیں؟"

یہ تیر ریچھ نے پھینکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سوال پوچھتے وقت نقاب کے پیچھے ریچھ کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی ہوں گی۔ مجھ غریب خرگوش کا تمسخر اُڑایا جا رہا تھا۔ پہلے سوچا اسے بتا دوں کہ ابھی تک تو مجھے گاجر کی امریکی انگریزی ہی آتی ہے۔ جب روسی گاجریں ملیں گی تو وہ بھی سیکھ لوں گا۔ مگر پھر چپ رہنے میں عافیت جانی۔



کچھ دُور چلنے کے بعد ہم ایک وسیع و عریض چوک میں داخل ہو گئے۔ چوک کے عین وسط میں جا کر تینوں لڑکیاں یکدم رُک گئیں۔

"یہ ترگنوف چوک ہے"

ریچھ نے خالص اُستادانہ انداز میں میری معلومات میں اضافہ کیا۔

"ترگنوف ــــ عظیم ترین روسیوں میں سے ایک"

عقاب کا لہجہ بھی ریچھ ایسا ہی تھا۔

"ترگنوف ــــ جس کی مختصر کہانیاں مجھے بے حد پسند ہیں"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر بڑے سکون سے کہا۔

اُن دونوں نے مایوسی سے اس طرح سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہوں۔ توبہ توبہ! یہ دن بھی آنے تھے۔ ایک خرگوش ترگنوف کے بارے میں باتیں کر رہا ہے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ساڑھے تین بجنے کو تھے۔ یکایک مجھے شدید تھکاوٹ کا احساس ہوا۔ میں جلد از جلد اپنے ہوٹل پہنچ کر بستر پر لیٹ جانے

کا خواہش مند تھا.... ان عجیب و غریب لڑکیوں کی دسترس سے باہر۔

"داس وے دانیا"

میں نے جلدی سے روسی زبان میں "خدا حافظ" کے الفاظ ادا کئے اور چوک سے باہر نکلنے والی بڑی سڑک کی جانب چل دیا۔

"ارے تم کہاں جا رہے ہو؟"

ریچھ اور عقاب نے پکارا۔

"ہوٹل ذولوتوئی کولیس"

میں نے رُکے بغیر ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"لیکن تم تو ابھی نہیں جا سکتے"

وہ میرے پیچھے چلی آئیں۔

میں شاید اب بھی نہ رُکتا مگر ایک مرتبہ پھر کھوپڑی کا مکروہ قہقہہ، ترگنوف چوک میں گونجنے لگا۔

"نہیں جا سکتے۔ نہیں جا سکتے"

وہ چلا رہی تھی۔

"شریر کہیں کی"

عقاب اپنی تیز چونچ ہلانے لگا۔

"شریر کہیں کی" ریچھ نے ہاں میں ہاں ملائی "ویسے ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ تم تو ابھی نہیں جا سکتے"

مجھے معلوم تھا کہ کھوپڑی دراصل ایک نقاب پوش لڑکی ہے۔ اُس نے جشن میں شامل ہونے کے لئے سوانگ بھر رکھا ہے۔ لیکن اُس کے وحشت ناک قہقہے نے میرے وجود کو خوف کے کالے سمندروں میں ڈبو دیا تھا۔ ایک ایسا خوف جو ہر "ہونے"

کو "نہ ہونے" سے ہوتا ہے۔ میں موت کی اندھی دنیا سے خوفزدہ تھا۔ میرے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ آخرکار میں رُک گیا۔

"لیکن کیوں؟ کیوں نہیں جا سکتا میں؟"

میں نے انتہائی بے بسی سے دریافت کیا۔

"ابھی بتاتی ہیں"

انہوں نے ہنس کر کہا اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔

بالآخر تینوں آگے بڑھیں اور ریچھ بڑے دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

"آپ کو یہ خرگوش کا نقاب بالکل اچھا نہیں لگ رہا..... اسے اتار دیجئے"

"جدا ہونے سے پیشتر ہم آپ کا اصل روپ دیکھنے کی متمنی ہیں"

عقاب نرمی سے بولا۔

فاختہ کچھ نہ بولی۔

میں چکرا گیا۔ آخر یہ کس قسم کی لڑکیاں ہیں۔

"میرا اصل روپ؟ بہت خوب! میں نے خرگوش کا یہ نقاب اپنی مرضی سے تو نہیں پہنا تھا۔ مجھے مجبور کیا گیا تھا۔ یاد ہے؟" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "تمہیں لوگ تو کہتے تھے یہ تم کیا اپنا اصلی روپ لئے پھرتے ہو۔ جشن کی رات سب کو نقاب پہننا پڑتا ہے۔ ہمیں تمہارا اصل روپ پسند نہیں"

"ہم اس سے قبل اپنے فعل پر شرمندگی کا اظہار کر چکی ہیں" ریچھ اور عقاب سر جھکا کر کہنے لگے۔ "ہم نادم ہیں۔ جب انسان ایک بڑے ہجوم کا حصّہ ہو تو وہ اس قسم کی حرکات کر بیٹھتا ہے۔ سرخ چوک میں خاصا اندھیرا تھا۔ ہم آپ کو ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ پائیں تھیں..... پلیز ہمیں اپنا چہرہ دکھا دیجئے۔ نقاب اُتار دیں"

فاختہ نے حسبِ معمول اِس بحث میں حصّہ نہ لیا۔ چُپ چاپ کھڑی رہی۔

اگر ان کی یہ ضد پوری کرنے سے گلو خلاصی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔
میں نے سوچا۔

"ٹھیک ہے میں نقاب اُتار دوں گا۔"

"خراشو۔ خراشو"

انہوں نے پسندیدگی کے اظہار کے طور پر رُوسی میں کہا۔

"لیکن ایک شرط ہے۔"

میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"وہ کیا؟"

ریچھ فوراً بولا۔

"وہ کیا؟"

عقاب نے دُہرایا۔

"آپ بھی اپنے اپنے نقاب اُتار دیجیے۔"

"ہمیں منظور ہے۔" دونوں نے کورس میں جواب دیا۔ "لیکن پہلے آپ" میں نے ترگنوف چوک کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ہم چاروں کے علاوہ وہاں کوئی بھی نہ تھا.... اور سر کے پیچھے بندھی گرہ کو کھول کر اپنا نقاب اُتار دیا.... میں خرگوش سے دوبارہ انسان کے روپ میں آگیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پہلے سے بالکل مختلف ہوں۔ ہلکا پھلکا اور لطیف۔ جیسے سفیدے کے درخت کی چھال اُترے تو اس میں سے نرم اور ٹھنڈا گودا نکل آتا ہے۔

وہ تینوں خاموش کھڑی مجھے تکتی رہیں۔

میں نے جیب سے سگریٹ نکالا اور سلگا کر ایک طویل کش لیا۔

"آپ بے شک اس نقاب کے بغیر بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"ریچھ نے بالآخر مُہرِ سکوت توڑی۔" ہم نے آپ کو خرگوش کا نقاب پہنا کر بہت بڑی غلطی کی تھی ...."

"خیر اس قصّے کو اب جانے دیجیے۔" میں پہلی مرتبہ خوش دلی سے مسکرایا۔

"اب میں بھی آپ تینوں کا اصل روپ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ہماری بھی ایک شرط ہے۔"

عقاب نے شرارت سے کہا۔

"وعدہ کریں کہ آپ ہماری دوست فاختہ کو اس کے گھر تک چھوڑ آئیں گے۔"

ریچھ بول اُٹھا۔

"نہیں ....."

فاختہ نے پھڑپھڑا کر پہلی مرتبہ لب کھولے۔ اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"تم مت بولو ...."

ریچھ نے اُسے ڈانٹ پلائی اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"اگر آپ ہماری یہ شرط منظور کر لیں تو ہم اپنی سہیلی کھوپڑی کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ اس سے خوفزدہ ہیں۔ کہیے ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔"

ان عجیب و غریب لڑکیوں کے ساتھ ساتھ مجھے موت سے بھی نجات مل رہی تھی اور میں اُن چہروں کو بھی ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا جنہوں نے ریچھ اور عقاب جیسے وحشت ناک جانوروں کا بھیس بدل کر جشن میں میرا چلنا پھرنا دوبھر کر دیا تھا۔

"نہیں! نہیں!"

فاختہ کُوکنے لگی۔

"تم خاموش رہو۔" عقاب نے درشتگی سے کہا۔ "یہ طریقہ کار بیحد مناسب رہے گا.... ہمیں تو صبح سویرے یونیورسٹی جانا ہے اور تم ....." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "بس آپ ہماری دوست کو گھر تک چھوڑ آنے کا وعدہ کریں تو ہم نقاب اُتار دیں گی۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

میں نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

عقاب کا ہاتھ اپنے نقاب کی گرہ تک گیا اور پھر فوراً ہی نیچے چلا آیا۔ "اس کے ساتھ ہی آپ کو یہ وعدہ بھی کرنا ہوگا کہ آپ ہماری سہیلی فاختہ کی باہوں میں باہیں ڈال کر چلیں گے۔"

میں شرما گیا۔ میں ابھی بہت چھوٹا تھا نا اس لئے!

"چلئے ہاتھ ہی پکڑ لیجئے گا۔"

عقاب چہکنے لگا۔

میں نے سر جھکا لیا "ٹھیک ہے۔"

دونوں نے بیک وقت اپنے چہرے پر بندھے نقاب اتار دیئے۔

ریچھ موٹا ہونے کے باوجود خوش شکل تھا۔ اس میں شاید جنسی کشش بھی ہوگی۔ میں ابھی عمر کے اس حصے تک نہیں پہنچا تھا جہاں ایک لڑکے کی حِس ان معاملات کے بارے میں کمپیوٹر کی طرح کھٹ سے کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔

اور عقاب .... بے حد تیکھا ناک نقشہ۔ اُس کے سوئیٹر تلے کے اُبھاروں کی طرح .... دونوں خوبصورت تھیں۔

فاختہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

"اور آپ؟"

میں نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"نہیں، نہیں۔"

وہ کسمسائی۔

پھر عقاب نے فاختہ کی انگلیوں میں سے اپنی انگلیاں علیحدہ کیں۔ ریچھ اُسے لے کر میری جانب بڑھا اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

"مضبوطی سے تھام لیجئے۔"

فاختہ کا ہاتھ بالکل سرد تھا۔

"آپ ہماری دوست کو گھر تک چھوڑ آئیں گے نا؟"

موٹی لڑکی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اور اس کا ہاتھ بھی تھامے رکھیں گے۔ ہوں؟"

لمبی لڑکی ہنس کر کہنے لگی۔

میں نے فاختہ کی جانب دیکھا۔ وہ بالکل خاموش اور بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ جیسے اپنے حال پہ قانع ہو۔ جیسے وہ اپنے بارے میں کئے جانے والے فیصلوں کو بامرِ مجبوری قبول کرتی ہو۔

"داس وے دانیا"

موٹی لڑکی نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا..... اس کا ہاتھ بے حد گرم تھا۔

"اُمید ہے ماسکو میں آپ کا قیام خوشگوار ثابت ہوگا۔"

لمبی لڑکی نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں فاختہ کو خدا حافظ کہے بغیر پیچھے مڑ کر بالشوئی تھیٹر کی جانب چل دیں۔

ہر طرف مکمل سکوت تھا۔

میں فاختہ کا ہاتھ تھامے اس وسیع چوک کے درمیان میں کھڑا عجیب سا محسوس

کر رہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ اکیلی گھر جانا پسند کرے۔ مجھے خیال آیا۔

"اگر آپ اکیلی ہی گھر جانا پسند کرتی ہوں تو میں ...."

"نہیں .... بالکل نہیں۔"

فاختہ نے میرا ہاتھ سختی سے بھینچ لیا۔

ہم دونوں فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ خالی سڑک پر چلنے لگے۔ خنکی کے باوجود میری ہتھیلی پسینے سے بھیگ رہی تھی اور فاختہ کی سرد انگلیاں مکمل طور پر میری گرفت میں نہیں آرہی تھیں۔

"تمہاری دونوں سہیلیاں بہت ہی عجیب و غریب کردار کی حامل ہیں۔"

میں نے گفتگو شروع کرنے کی غرض سے کہا۔

"میری سہیلیاں؟" وہ کھوسی گئی۔ "وہ میری سہیلیاں تو نہیں .... خود غرض اور مغرور .... اُن کی شخصیتیں صرف نقاب پہن کر ہی مکمل ہوتی ہیں۔"

"نقاب تو تم نے بھی پہن رکھا ہے!"

"نقاب میری ضرورت ہے۔"

میں نے فاختہ کے ہاتھ میں کپکپاہٹ سی محسوس کی۔

"اگر تمہیں سردی محسوس ہو رہی ہے تو میں اپنا کوٹ اُتار کر تمہیں پہنا دیتا ہوں۔"

"نہیں ....،" اس نے سختی سے کہا۔ "بس آپ میرا ہاتھ مت چھوڑیں۔"

"بہتر۔"

میں نے کندھے سکیڑ کر کہا۔

اب ہم کاموسولکایا چوک میں سے گزر رہے تھے اور ہمارے سامنے عظیم الشان ہوٹل لینن گراڈ کی جدید عمارت کھڑی تھی۔ ہوٹل کے کسی کمرے میں بھی روشنی نہ تھی۔ جشن

کے دوران میں تمہاری سہیلیاں۔ میرا مطلب ہے ریچھ اور عقاب تو ہر جگہ میرا پیچھا کرتے رہے مگر تم مجھے کہیں بھی نظر نہیں آئیں!"

"ہیں؟" فاختہ نے سر جھٹکا۔ "میں بھی تمہیں نہیں دیکھ سکی .... میں تو آنا ہی نہیں چاہتی تھی مگر وہ مجھے زبردستی کھینچ لائیں .... خیر اب وہ جا چکی ہیں اور میں بے حد پرسکون محسوس کر رہی ہوں۔" وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموشی سے چلتی رہی اور پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولی "کیا ہم جشن کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں،" میں نے سگریٹ کا آخری کش لگا کر اسے پاؤں تلے مسلتے ہوئے کہا "لیکن ایسی گفتگو کا آغاز تمہیں کرنا ہوگا۔"

"اچھا تو تم نے اب تک ماسکو میں کیا کیا دیکھا ہے؟"

اُس نے فوراً پوچھا۔

"لینن سٹیٹ لائبریری۔ لینن عجائب گھر۔ کریملن۔ زراعتی نمائش، لینن کا مقبرہ ...."

میں نے پچھلے چند روز کی مصروفیات کی پوری فہرست سنادی۔

"تم نے لینن سٹیڈیم نہیں دیکھا کیا؟ سنا ہے اس میں ڈیڑھ لاکھ تماشائی سما سکتے ہیں؟"

"آج پچھلے پہر نوجوانوں کے پانچویں عالمی میلے کا افتتاح لینن سٹیڈیم میں ہی تو ہوا تھا۔" مجھے اس کی کم علمی پر حیرت ہوئی۔ "ویسے رُوسی لڑکیاں کھیلوں کی بے حد شوقین ہوتی ہیں۔ تمہیں کون کون سا کھیل پسند ہے۔ ٹریک؟ سومنگ؟ والی بال ...."

"مجھے؟" اس نے جلدی سے کہا۔ "مجھے کوئی کھیل پسند نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔"

"مجھے بھی کھیل پسند نہیں" میں نے ہنس کر کہا "لیکن سیر و سیاحت کا شوق جنون کی حد تک ہے ..... ماسکو کے علاوہ تم نے روس کے اور کون کون سے شہر دیکھے ہیں؟"

"میں نے تو ماسکو بھی نہیں دیکھا"

اس نے سر جھکا لیا۔

میں اس کے اس فقرے کی تہ تک نہ پہنچ سکا ..... جس لڑکی کی اتنی عجیب و غریب قسم کی سہیلیاں ... یا واقف ہوں وہ خود بھی تو نارمل نہیں ہو سکتی ..... میں نے سوچا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم دریائے ماسکو جسے مقامی لوگ "مسکوا" کہتے ہیں کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں نسبتاً خنکی زیادہ تھی۔ کچھ فاصلے پر بارڈنسکی پُل دکھائی دے رہا تھا جہاں سے ہم نے دریائے ماسکو کو عبور کرنا تھا۔ دریا کے کنارے ایک خوبصورت سیرگاہ بنی ہوئی تھی۔ ہم اس سیرگاہ کے بیچوں بیچ پُل کی جانب چلنے لگے۔

دریائے ماسکو کے عین اُوپر ایک رنگین ہوائی فضا میں تیر گئی۔ اُس کے شوخ رنگ دریا کے پانی میں منعکس ہوئے اور پھر آخر میں ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ فاختہ ایک نیم دائرے میں گھوم کر بے اختیار میرے سینے کے ساتھ آ لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے برف کی ایک سِل کو اپنے آغوش میں لے لیا ہو۔ اس کا پورا جسم بالکل ٹھنڈا تھا۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "یوں لگتا ہے جیسے جشن کے لئے آتش بازی کا ذخیرہ ابھی ختم نہیں ہوا"

"آتش بازی؟"

اُس نے سہم کر کہا۔ اس کی انگلیاں ایک آہنی زنجیر کی مانند میری انگلیوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے مجھے سختی سے بھینچ رکھا تھا۔ برف کی سِل زندہ تھی۔

اُس کے دل کی دھڑکن میری چوڑی چھاتی پر ہولے ہولے دستک دے رہی تھی۔ سہمی ہوئی فاختہ!

میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے سنہری بالوں پر رکھ دیا۔

"پلیز مجھے معاف کر دیجئے ...." وہ فوراً مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ لیکن حسبِ سابق میرا ہاتھ تھامے رکھا "مجھے دھماکوں سے بے حد خوف آتا ہے"

"یہ نسوانی فطرت ہے۔ اکثر لڑکیاں دھماکوں سے ڈرا ہی کرتی ہیں۔ حالانکہ ...."

"لیکن سبھی دھماکے ایک جیسے نہیں ہوا کرتے ...." اس نے رُک کر کہا "ان میں آگ ہوتی ہے .... جسم کو جلا دینے والی .... پگھلا دینے والی ...."

وہ پھر لایعنی باتیں کر رہی تھی۔

"دریائے ماسکو نے بھی تاریخ کے کتنے انقلاب دیکھے ہیں" میں نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا اور چلنا شروع کر دیا "نپولین کی فوج میں شامل چند گھڑ سواروں نے جب یخ بستہ اور جمے ہوئے دریائے ماسکو کو عبور کرنا چاہا تو برف چٹخ گئی اور اُن میں سے اکثر اپنے گھوڑوں سمیت دریا میں ڈوب گئے ...."

"دریائے ماسکو ....؟"

"ہاں دریائے ماسکو .... تین روز پیشتر ہم سب سٹیمر پر بیٹھ کر ماسکو سے باہر ایک سفید جنگل میں گئے تھے"

"سفید جنگل؟"

اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں دودھیا سفید۔ سفیدے کے لاکھوں بلند درختوں کا جنگل۔ اُن درختوں کی چھاؤں میں ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ تھا .... بے حد خوبصورت!

ہمارے مترجم یونا نے اکارڈین بجانا شروع کر دیا۔ چونکہ ہمارے ساتھ کوئی لڑکی

نہ تھی اس لئے لڑکوں نے ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر ناچنا شروع کر دیا۔"

"سچ ؟.... کتنی عجیب بات ہے !"

وہ کھکھلا کر ہنس دی۔ کُوکنے لگی۔

"عجیب بات تو یہ ہے کہ ہم دونوں پچھلے ایک گھنٹے سے ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے ہیں اور تم نے ابھی تک اپنا نقاب نہیں اُتارا .... تمہارا اصل ...."

"نہیں ! .... میرا مطلب ہے ابھی نہیں۔" اُس نے گھبرا کر کہا اور پھر یکدم موضوع بدل دیا۔ "تم نے مجھے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

میں نے اپنا نام بتایا۔

"یہ تو بہت مشکل ہے ...."

"رُوسی ناموں سے زیادہ مشکل تو نہیں .... "شاریکو پوڈشی پنیکووسکایا" کے بارے میں کیا خیال ہے ؟"

"یہ تو ایک سڑک کا نام ہے۔" اس نے محظوظ ہو کر کہا۔ "ویسے میں تمہارا نام ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ اخیگ ڈاہ ! ہمیشہ !"

ہتھیلی میں آئے ہُوئے پسینے کی وجہ سے میری انگلیاں بار بار فاختہ کی انگلیوں میں سے پھسل رہی تھیں۔ میں اب فاختہ کی جانب دیکھتا تو مجھے بے حد اُلجھن ہوتی۔ آخر وہ نقاب اُتارنے سے گریزاں کیوں ہے ؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ریچھ اور عقاب کی مانند وہ خوش شکل نہ ہو۔ احساسِ کمتری کی شکار !

"تم نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم کون سے شہر کے رہنے والے ہو !"

اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

"لاہور"

"ہندوستان کا ایک تاریخی شہر ؟ ہوں ؟"

"پاکستان کا ...."

میں نے ترش ہو کر کہا۔ عام طور پر رُوسی لڑکیاں بے حد ذہین ہوتی ہیں۔ مگر یہ فاختہ تو بالکل اَن پڑھ لگتی تھی۔

"ہاں .... پاکستان"

اس نے سر ہلا دیا۔

"اور تم ؟"

"میں مِنسک کی رہنے والی ہوں۔"

"مِنسک"

میں نے آہستہ سے دُہرایا۔

"ہاں مِنسک۔ بیلورشیا کا صدر مقام"

"اس شہر کا نام مجھے ہمیشہ اُداس کر دیتا ہے۔"

"کیوں ؟"

فاختہ کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔

"وارسا سے ماسکو آتے ہوئے ہماری گاڑی رات کے کسی پہر مِنسک کے ریلوے سٹیشن پر رُکی۔ اگرچہ گارڈ نے ہمیں خبردار کر دیا تھا کہ کوئی مسافر اپنے ڈبے سے نیچے نہ اُترے ورنہ اُس کے ہجوم میں کھو جانے کا خدشہ تھا۔ مگر میں سٹیشن پر جمع اتنے سارے شفیق چہرے دیکھ کر رہ نہ سکا اور پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ فوراً ہی بے شمار لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے مجھے ماسکو سے واپسی پر مِنسک میں قیام کرنے کی دعوت دی اور پھر بڑی دلچسپی سے میری باتیں سننے لگے۔ ایک لڑکی نے مترجم کے فرائض سنبھال لئے۔ میں انہیں اپنی مذہبی اور ثقافتی رسوم کے بارے میں بتانے لگا۔ اچانک میری

نگاہ ہجوم سے پرے ایک باریش کبڑے بوڑھے پر پڑی جو ٹکٹوں کی کھڑکی کا سہارا لئے ٹکٹکی باندھے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ جونہی ہماری نظریں ملیں وہ تیزی سے چلا اور لوگوں کو چیرتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے لوگوں کو پرے دھکیل کر سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا۔ اُس کی نیلی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی....

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا اور پھر یک لخت مجھے گلے لگا کر چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اُس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ وہ بار بار روسی زبان میں مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کرتا۔ میرے گالوں اور پیشانی پر شفقت سے بوسے دیتا اور پھر لپٹ کر رونے لگتا۔ پاس کھڑی لڑکی نے روسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ بوڑھا کہہ رہا تھا کہ میرے پانچ نوجوان بیٹے تھے۔ بلند ترین پہاڑوں سے بھی قد میں نکلتے ہوئے۔ ان کے سینے مادرِ وطن رُوس سے بھی وسیع تھے۔ کاکیشیا کی حسیناؤں سے بڑھ کر خوبصورت... وہ پانچوں دوسری جنگِ عظیم میں نازیوں کے ہاتھوں مارے گئے.... تم ہوبہو میرے سب سے چھوٹے اور سب سے لاڈلے بیٹے کی مانند ہو.... میں ٹکٹوں کی کھڑکی کے پاس کھڑا تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا... مجھے اپنا بیٹا یاد آگیا... تم ہی میرے بیٹے ہو.... بیٹے دنیا کی باگ ڈور اب تم جیسے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے.... یاد رکھنا جنگ سے آج تک کوئی مسئلہ طے نہیں ہوا۔ صرف لاکھوں کروڑوں نوجوان بیٹے لاشے بن جاتے ہیں۔

نوجوان بیٹے جو برسوں کی محنت اور محبت سے بمشکل پلتے ہیں اور لاشے جو دو دن میں گل سڑ جاتے ہیں۔ میرے بیٹے جنگ بے حد ہولناک چیز ہوتی ہے.... میں نے اس کی تباہ کاریاں دیکھی ہیں۔ میری ایک درخواست ہے.... میں تمہارا باپ ہوں.... کبھی جنگ نہ ہونے دینا۔ اپنے ہونے والے بیٹوں کی خاطر دنیا کو ہمیشہ جنگ سے بچائے رکھنا۔

میں یک لخت خاموش ہوگیا۔ میں فاختہ کو نہیں بتانا چاہتا تھا کہ وطن سے دور اس بوڑھے کے سینے کے ساتھ لگ کر میں نے اپنے باپ کی شفقت کی حرارت محسوس کرلی تھی اور پھر میں بھی بلک بلک کر رونے لگا تھا۔

"ہاں! جنگ بہت ہولناک ہوتی ہے۔" فاختہ نے بمشکل کہا۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی" اور منسک.... منسک میں بسنے والے لوگ ان ہولناکیوں کا سب سے زیادہ شکار ہوئے... روزانہ سینکڑوں جرمن طیارے ہمارے خوبصورت شہر پر آگ کی بارش کرتے.... میرا پیارا شہر دن رات سلگتا رہتا... ہمارا مکان منسک کی اُن چند عمارتوں میں سے ایک تھا جو ابھی تک جرمن بمباری سے محفوظ تھیں.... میری ماں .... میری بوڑھی ضعیف الاعتقاد ماں مجھ سے کہا کرتی تھی" میں خداوند یسوع پر ایمان رکھتی ہوں.... جرمن کبھی بھی ہمارے مکان کو تباہ نہیں کر پائیں گے.... یسوع ہماری مدد کو آئے گا"، مگر پھر ایک شب ہزار پاؤنڈ وزنی آتشیں بم ہمارے صحن کے عین بیچ میں آگرا۔ ایک دھماکہ.... ایک چمک پیدا ہوئی.... آنکھوں کو چندھیا دینے والی چمک .... پورے چھ ماہ بعد مجھے ماسکو کے ایک ہسپتال میں ہوش آئی.... میرا پورا خاندان مکان کے ملبے تلے دفن ہوچکا تھا"

میں نے فاختہ کی جانب دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے باتیں کرتی چلی جا رہی تھی۔

"مجھے بے حد افسوس ہے"

میں نے اس کا ہاتھ دبا کر آہستگی سے کہا۔

"ہوں"

اُس نے صرف سر ہلا دیا جیسے وہ اس قسم کے رسمی فقرات کی عادی ہوچکی ہو۔

ہم خاموشی سے چلتے گئے۔

ہوا چلتی تو فاختہ کا سفید لباس فضا میں پھڑپھڑاتا۔ وہ اُسے اپنے دوسرے ہاتھ

سے تھپک کر نیچے کر لیتی۔ اُس کے قدم نہایت نپے تُلے تھے اور وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ صرف میری وجہ سے تمہیں اتنی دور تک آنا پڑا۔ میرا گھر.... میرا ہوسٹل یہاں سے ابھی ایک کلومیٹر تو ضرور ہو گا۔"

"اور تم ایک کلومیٹر کا یہ فاصلہ نقاب پہنے ہوئے ہی طے کرو گی؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ میری اُلجھن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ٹھیک ہے اگر وہ قبول صورت نہیں بھی تو مجھے اس سے کیا؟ میں اپنے فطرتی تجسس کو مزید نہیں دبا سکتا تھا۔ میں اُسے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ "اسے اُتار دو پلیز!"

"نہیں نہیں" فاختہ نے دوسرے ہاتھ سے اپنا نقاب تھام لیا۔ جیسے اُسے خدشہ ہو کہ میں زبردستی پر اُتر آؤں گا۔ "میں ابھی نقاب نہیں اُتاروں گی۔ ہوں؟"

ے "ہور ناں نال ہسندی کھڈندی شو نال گھونگھٹ کیوں؟"

مادھو نے میرے کان میں چپکے سے کہا اور میں نے شاہ حسین کا یہ پیغام ترجمہ کر کے فاختہ تک پہنچا دیا۔

وہ فوراً رُک گئی۔ ایک لمحے کے لئے میری جانب دیکھا اور پھر چپکے چپکے ہنسنے لگی۔

"اونہوں! تم غلط سمجھے ہو۔ اس قسم کا ہنسنا کھیلنا میری زندگی کا جز نہیں ہے اور پھر میں یہ کیسے جان سکتی ہوں کہ تم...." اُس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اچھا صرف ایک منٹ کے لئے نقاب اُتار دو۔ میں تمہیں دیکھ لوں پھر بے شک ساری زندگی نہ اُتارنا۔"

میں ضد پر اُتر آیا۔

"نہیں۔"

اُس نے درشتگی سے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

میں سنجیدہ ہو گیا۔

"پلیز بُرا نہ مانو۔" اس نے بے حد ملائمت سے کہا "صرف تھوڑی دیر...."

"ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! میں کیوں بُرا ماننے لگا۔"

میرا لہجہ خاصا ترش تھا۔

لڑکیوں کے بارے میں میرا تجربہ کچھ اتنا وسیع تو نہ تھا کہ میں فاختہ کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا مگر جذباتی طور پر اس کے انکار نے میری انا کو ٹھیس ضرور پہنچائی تھی۔ ویسے میں چاہتا تو اُسی وقت اُسے وہاں چھوڑ کر جا بھی سکتا تھا لیکن فاختہ کا اصل جاننے کا تجسس میرے پاؤں کی زنجیر بنا رہا.... اور پھر وہ مجھے ماسکو سے دور پنجاب کے کسی دور افتادہ گاؤں کی یاد بھی تو دلا رہی تھی۔ جہاں کی تپتی دوپہر کی دو علامتیں ہمیشہ میرا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ آٹا پیسنے والی چکی کے انجن کی لگاتار "ٹک ٹک" اور کیکر کے پر خار درخت میں بیٹھی اکلوتی فاختہ کی اُداس گُوگُو۔ گُوگُو۔ وطن کی یاد نے مجھے بے حد اُداس کر دیا۔ میں اس لڑکی.... اس فاختہ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہوسٹل پہنچنے پر "داس وے دانیا" کہہ کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو جائے۔ وہ میرے وطن کی علامت تھی۔ اکلوتی اور اُداس فاختہ۔

ہم بارڈلنکی پُل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پُل کے اس پار اس کا ہوسٹل تھا۔

"اگر تم پسند کرو تو ہم تھوڑی دیر کے لئے نیچے دریا کے کنارے کسی بنچ پر بیٹھ کر ستا لیں۔ میں صبح سے پیدل چل رہا ہوں اور خاصا تھک گیا ہوں۔"

میں نے تجویز پیش کی۔

"ہم دونوں؟"

فاختہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں! صرف تھوڑی دیر کے لئے۔ میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جاننے کا خواہشمند ہوں۔"

میں نے مسکرا کر کہا اور ہم دونوں بارووڈنسکی پُل کے پہلو میں ایستادہ یونانی ستونوں کے برآمدے میں آگئے۔ یہاں سے دریا کی سطح تک کوئی درجن بھر سیڑھیاں اُترتی تھیں۔

"سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے چلتے ہیں۔"

"سیڑھیاں؟"

وہ ہچکچائی۔

"ہاں نیچے تو دریا کے کنارے کے ساتھ ہی ہوں گے نا؟" میں نے اُسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ دور سُرخ چوک کے عین اُوپر آسمان پہ ایک گلرنگ انار چھوٹا اور پھر ساتھ ہی ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ فاختہ کے قدم لڑکھڑائے۔ میں نے جلدی سے اُسے سہارا دینے کی کوشش کی مگر اس کی انگلیاں میری نم آلود گرفت میں سے پھسل کر علیحدہ ہو چکی تھیں۔ اس کا سفید لباس ایک پھریرے کی مانند ہوا میں لہرایا اور وہ درجن بھر سیڑھیوں پر سے کفن میں لپٹی ایک لاش کی طرح لڑھکتی ہوئی دریا کے کنارے پر جا گری۔ میں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اُس کے پاس جا پہنچا۔

"میں پھر ڈر گئی تھی۔" وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"دیکھ کر چلا کرو۔" میں نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا اور اُس کے دونوں بازو تھام لئے۔

"میں دیکھ کر نہیں چل سکتی۔ میری آنکھیں نہیں ہیں.... یسوع میری ماں کی مدد کو نہ آیا...." اس نے سسکی لے کر کہا اور پھر چہرہ میری جانب اٹھا کر اپنا نقاب اُتار دیا.... ایک خوبصورت مجسمہ جسے تخلیق کر کے خالق نے اُس کی آنکھوں پر مٹی کا

لیپ کر دیا تھا۔

اُسی لمحے ایک اور گلرنگ انار چھوٹا اور دریائے ماسکو کا پانی سُرخ ہو گیا۔

سُرخ!

